ہفت روزہ حیدرآباد

راہی

۲-۹ جون ۷۸

STUDIO SHAMIM

یحییٰ بھی بولے....

سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل

قیمت ۴ روپے

الفتح کا قافلہ بڑھتا ہی رہے گا

ہفت روزہ الفتح کی بندش کا نہ صرف مجھے بلکہ ملک کے تمام روشن خیال، جمہوریت پسند اینٹی سامراج عناصر کو صدمہ ہوا ہے قابل مبارکباد ہیں آپ لوگ کہ ہر دور میں خواہ وہ یحییٰ خان کا دور ہو، ایوب خان کی آمریت ہو پیپلز پارٹی کا عہد ہو یا موجودہ دور، ہمیشہ بنیادی حقوق جمہوریت معاشی انصاف کی بات ہے اور مصلحت کوشی سے کبھی کام نہیں کیا۔ اور اپنی ترقی پسند پالیسی سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

حق و انصاف کا بول بالا رکھنے کے لئے جن مصائب سے الفتح دوچار ہے ہمیں اس کا احساس ہے اور خوشی ہے کہ باوجود ان تمام مشکلات کے الفتح کا قافلہ کبھی رکا ہے اور کبھی ہفت روزہ راہی کے روپ میں رواں دواں ہے تاریخ آپ کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

محمد جمال خان بلوچ ایڈووکیٹ جھنگ

مودودی اور انقلاب کابل

مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ افغانستان کی سیاسی تبدیلی سے نئے پاکستان میں اشتراکیت نفوذ نہیں کر سکے گی مفتی محمود کا تجزیہ اس کے برعکس ہے۔ وہ افغانستان کے حالیہ سیاسی انقلاب سے پاکستان کے متاثر ہونے میں یقین رکھتے ہیں علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا

تم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسے کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام
اگر یہی لوگ قومی حکومت میں شامل ہونے تو کہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

عطرت حسین

قومی اتحاد سے ایک سوال

پاکستان میں صحافیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے، طلباء، محنت کشوں اور دانشوروں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کرنے پر پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے اور کوڑوں کی سزائیں دی جاتی ہیں تعلیمی ادارے بند کر دیئے جاتے ہیں اور طلباء کو ۔۔۔ مستقبل کے بارے میں ان کو غیر یقینی کیفیت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے قومی اتحاد کے لیڈر اور سامراجی ایجنٹ جو کل تک عوام کو نام نہاد نعروں سے بے وقوف بنا رہے تھے آزادی صحافت کے علمبردار بنتے تھے خصوصی عدالتیں اور ٹریبونل ختم کرانے کا مطالبہ کرتے تھے پریس اور مطبوعات پر عائد کردہ پابندیاں ختم کرانے اور جرائد کے منسوخ شدہ ڈیکلریشن بحال کرانے کا مطالبہ کرتے تھے آج کیوں خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں کیا آج جو کچھ ہو رہا ہے ان کے نزدیک جائز ہے کیا عوام ان کے نعروں کو بھول چکے ہیں کیا اب یہ عوام کے سامنے آنے کے قابل ہیں کیا یہ لوگ انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آ سکتے ہیں۔ اب یہ صرف نام نہاد قومی حکومت میں شامل ہو کر ہی برسر اقتدار آ سکتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اقتدار ہی کے بھوکے ہیں عوام کے اور ملک کے حالات سے کیا یہ چور دروازے سے آکر ترقی پسندوں کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ افغانستان کے انقلاب کے بعد سے پاکستان کے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے لیے شکنجہ سخت کیا جا رہا ہے اور کئی لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے جن میں سندھ این ایس ایف کے مرکزی صدر نذیر عباسی، حمیدہ گھانگھرو، بالو تمرانی، رستم ناریجو حبیب اللہ شاکر، مزدور لیڈر جاوید شکور اور کئی صحافی شامل ہیں۔ کیا ان لوگوں کی گرفتاری سے جمہوری انقلاب رک جائے گا۔ اور عوام کی مثبت سوچ کو بدلا جا سکتا ہے۔

رفیق گوجرا ایم سی جامشورو۔

یہ اسلام پسند

۱۴ مئی کا ایک اخبار میرے ہاتھوں میں ہے، اچانک نگاہ ایک سرخی پر پڑی لکھا ہوا تھا "عدلیہ پر غیر ملکی الزام تراشی کی مذمت پاکستان بار کونسل کی قرارداد" آگے لکھا ہوا تھا کہ "پاکستان کے تمام سفارت خانوں کو چاہیئے کہ وہ بیرونی ملک تمام حکومتوں اور عوام کو بھٹو کے مظالم اور کرتوت بتائیں اور یہ کہ پاکستان میں ایسے ظالم شخص کا کوئی دوست نہیں"

سنتے ہیں یہ بار کونسل والے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ قانون کے ماہر ہوتے ہیں اور یہ قرارداد پاس کرنے والے حضرات اسلام پسند بھی ہیں اور ایسے آج کل یہ عجیب "وبا" پھیلی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے افسر سرمایہ دار، جاگیردار، بلیک مارکیٹر اور رشوت خور لوگ بھی ہر وقت اسلام اسلام کرتے ہیں آپ کوئی بھی اخبار پڑھیں جس بھی افسر یا صاحب لوگوں کے بیانات ہوں اسلام کا ذکر ضرور ہوگا کیا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے ملک میں اسلام نہیں تھا یہ لوگ اسلام کے ٹھیکے دار بننے والے کون ہوتے ہیں جب یہ صاحب لوگ اسلام کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوتے ہیں تو کوئی ان سے پوچھے قبلہ آپ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہے۔ آپ زکواۃ دیتے ہیں اگر آپ اسلام کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں تو آپ کے پاس اتنی بڑی جائدادیں دولت سے بھری ہوئی تجوریاں اور لمبی لمبی کاریں کیوں ہیں آپ حاکم لوگ سر سبز گارڈنوں میں بیٹھتے ہیں۔ آپ کے کتے تک دودھ پیتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں نرم گدیلوں پر سوتے ہیں اور آپ کے ملک کے لاکھوں عوام بھوکے ننگے پاتھ پر سوتے ہیں آپ نے ان کے لیے کیا کیا ہے میں قرارداد پاس کرنے والے محب وطن قانون دانوں سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے دنیا کے ایک عظیم رہنما کی سزائے موت ختم کرنے کی اپیلوں کو مداخلت قرار دیا ہے اور مذمت کی ہے آپ نے ایک اسلامی ملک افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے والے مولویوں اور جاگیرداروں کی مذمت کیوں نہ کی، خاموش کیوں رہے آپ فرماتے ہیں کہ پاکستان میں بھٹو کا کوئی دوست نہیں ہے آپ کو اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنی چاہیئے تھی آپ تو شاید جانتے ہوں کہ اسلام میں جھوٹ بولنے والوں پر لعنت کی گئی ہے اگر بھٹو کا کوئی دوست نہیں تو آپ کے لیے یہ لوگ انتخابات کیوں نہیں کراتے بھٹو کی بیٹی اور بیوی کو نظر بند کیوں کیا گیا ہے ملک کی تمام جیلیں کن لوگوں سے بھری پڑی ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا فانی ہے ہم سب نے مر جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر کی عدالت میں پیش ہونا ہے خدا کے لیئے ملک کو بھٹو دشمنی کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔

محمد عباس بلوچ، ابدالی روڈ۔ (ملتان)

مودودی نے یہ کیا ظلم کیا؟

کیا یہ مارشل لا ء والوں کا انصاف ہے کہ کسی کو کوچھینک مارنے پر کوڑے لگ رہے ہیں اور کوئی ریڈیو پاکستان پر کھڑے ہو کر چیف مارشل لاء کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو ان کے پاؤں دھو کر پیئے جاتے ہیں۔ مولوی مودودی کے انٹرویو کا یہ حصہ آپ دیکھیں جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا تھا۔

"لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ کرتا ہے پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایک قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے وہ ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن سے فحاشی اور جرم نشوونما پاتے ہیں اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لیے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نگل جاتا ہے"

آپ انصاف کریں کہ مولوی مودودی نے ہمارے جرنیل صاحب کو بہت بڑا ظالم کہا ہے یا نہیں کہا ہے ہم کو یہ بات بہت بری لگی ہے مولوی مودودی کو اس کی سزا کیوں نہیں ملتی۔

نوروز خان۔ نیا محلہ راولپنڈی)

طلباء صحافیوں کے ساتھ ہیں

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر جناب جان عالم نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ان کی تنظیم پی ایف یو جے اور ایپنک کے آٹھ نکاتی مطالبات کی بھرپور حمایت کا اعلان کرتی ہے اور یہ اعلان کرتی ہے کہ اخباری کارکنوں نے اپنے ان مطالبات کے حق میں جو بھی لائحہ عمل بنایا گے۔ طلباء برادری اس میں پوری قوت اور عزم کے ساتھ حصہ لے گی کیونکہ آزادی، آزادی اظہار اور جمہوری حقوق پر بندش قوم کے لیئے ہلاکت آفرین ثابت ہو گی اخبارات عوام کو حالات سے باخبر رکھتے ہیں اور ان پر بے جا پابندیاں عائد کی گئیں تو ملک میں جمہوری عمل رک جائے گا۔ اور عوام انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔ جان عالم نے کہا کہ روزنامہ مساوات لاہور کی اشاعت پر پابندی ایک جبری عمل ہے اور اسے سیاہ قوانین کے تحت بند کیا گیا ہے اگر حکومت کسی اخبار کے خلاف عام قوانین کے تحت اور عام عدالتوں میں کارروائی کرنے کی بجائے سیاہ قوانین کا سہارا لیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا موقف بے بنیاد ہے آج کل اختلافی نکتہ نظر رکھنے والے اخبارات کو جس عریانیت کے ساتھ ہراساں کیا جا رہا ہے اس کی نمایاں شکل سے ہی ملے گی۔ ہر اخبار کو خواہ وہ کسی نکتۂ نکر سے تعلق رکھتا ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پالیسی کے تحت حالات کا تجزیہ پیش کرے اور عوام کو ان سے باخبر رکھے۔ کسی شخص یا جماعت کو اس کا اجازہ نہیں دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں پر مسلط کرے۔

جان عالم۔

ہفت روزہ

راھی

حیدرآباد

جلد: ۸ شمارہ: ۱

۲-۹ جون ۱۹۷۸

قیمت: ۴ روپے

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
راشد بشیر

کالم نگار
حسین نقی، شبیہ الحسن

خاصِ مضامین

کچھ سچ کچھ جھوٹ
امر جلیل

طنز و مزاح
ابو ضیا اقبال

انتظامی امور
حاجی عدیل

سرورق
سعید الدین حسین

اسلام آباد
حمیر شیراز

ضلعی نمائندے

میرپور خاص
محبوب احمد

فیصل آباد، گوجرانوالہ
طارق سعید

سانگھڑ
ایاز سندھی

شیخوپورہ
ٹوبہ ٹیک سنگھ
غیاث الدین جانباز

میرپور، سکھر
جیکب آباد، لاڑکانہ
ابراہیم عباسی

گوادر
سلیمان شیرف

ٹنڈو الہ یار
کامل سمعون

میانوالی
دشن ملک

ملتان
ناصر زیدی

کشمیر
سید نذیر گیلانی

غیر ممالک

پیکنگ
رشید بٹ

ماسکو
محمد زاھد

کینیڈا
سعید ابن سعود

لندن
عبدالحفیظ قریشی

یورپ: فاروق طارق

متحدہ عرب امارات
مقیم دوبئی
غلام جیلانی

صوبائی نمائندے

سندھ مقیم حیدرآباد
احسان عظیم

پنجاب مقیم لاہور
کاشف

سرحد مقیم پشاور
شہزاد غزنوی

بلوچستان مقیم کوئٹہ
ناصر عرفات

چیف ایڈیٹر
مولانا ابو الفتح غلام رسول چشتی

پبلشر احمد راھی نے
یاسیات پریس سے
چھپوا کر دفتر ہفت روزہ
راھی نائن کا پڑ حیدرآباد سے شائع کیا

دفتر رابطہ
الفتح مطبوعات
۶۹-۵ ڈی ترسری کمرشل
پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹
فون ۴۳۲۲۷۴۰

مشیر صحت کو علاج کی ضرورت ہے!

حالات کی ستم ظریفی نے پاکستان کی انتظامی افق پر ایک ایسی ہستی کو ابھارا ہے جو اپنے غیر متوازن پھیلاؤ سے مقوی دواؤں کا اشتہار اور اپنے ذہنی عدم توازن کی بنا پر دواؤں کے اور علاج کی حاجت کا اعلان ہیں۔ موصوف فوجی حکومت کے مشیر صحت بنا دیے گئے ہیں۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ دوا سازی کی صنعت کے ذریعے منفعت اندوزی میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ ورنہ اکتیس سال کی سیاسی اُلٹ پھیر میں وہ کبھی منظرِ عام پر نظر نہیں آئے تھے۔ ذکران موصوف کا یوں چھڑا کہ وہ سرکاری خرچ پر امریکہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے یہ انکشاف کیا کہ آزادیٔ صحافت کی جدوجہد میں بھوک ہڑتال کرنے والے جیالے اصول پرست صحافیوں کو فی کس پندرہ ہزار روپے ادا کیے جا رہے ہیں۔ مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اطلاع انہیں کب، کہاں اور کس ذریعے سے ملی۔ اگر انہیں پاکستان میں رہتے ہوتے یہ علم ہوا تھا تو اس کے اظہار میں کونسی چیز آڑے آئی؟۔ اگر انہیں یہ اطلاع واشنگٹن میں ملی یا وہاں کسی نے انہیں ایک وسیع دعریض بھو نپو کے طور پر استعمال کیا تب بھی ذریعہ اطلاع کا انکشاف کرنے سے ہنٹوں کا بھلا ہو گا۔ اگر انہیں پندرہ ہزار کے اس بغیر سرمایہ کاری کے خالص منافع پر رشک آرہا ہے تو ہم انہیں یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ وہ واشنگٹن۔ ڈی۔ سی میں پاکستانی صحافیوں کی جدوجہد کے خلاف بھوک ہڑتال کریں۔ پاکستانی عوام چندہ کر کے انہیں پندرہ ہزار ڈالر معاوضہ ادا کریں گے۔ اس خالص منافع کے علاوہ درجات میں ترقی بطور بونس ملے گی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس نامعقولیت کا مظاہرہ کیوں ہوا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے عوام کو اپنی سیاسی تاریخ میں پہلی بار اعصابی اور نفسیاتی جنگ کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے لیکن یہ اعصابی اور نفسیاتی جنگ انتہائی بھونڈے طریقے پر لڑی جا رہی ہے۔ اس جنگ کی کمان کرنے والے یہ بھول گئے ہیں کہ دہشت گردی صرف خوف ہی نہیں نفرت بھی پیدا کرتی ہے۔ مسلسل غلط بیانی اور وعدہ خلافی بے اعتباری اور بداعتمادی کے سوا اور کچھ نہیں دیتی — یہی یکطرفگی انہیں حقیقتوں کو جھٹلانے اور اصولی جدوجہد میں خرید و فروخت کے عنصر کو داخل کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر ہماری یہ بات درست نہیں تو پھر کوئی ہمیں بتائے کہ غیر نمائندہ لوگوں کو نمائندہ بنانے کا ڈھونگ رچا کر اخباری صنعت کے کارکنوں کو فریب دینے اور ان کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی ناکام کوششیں کیوں جاری ہیں؟ یہ دہائی کیوں دی جا رہی ہے کہ صحافیوں کی نمائندہ تنظیموں اور مسلمہ رہنماؤں نے تصادم کی راہ اختیار کی جبکہ ۳۰ر اپریل تک حکومت کے پاس پورا پورا موقع تھا کہ اصولی معاہدہ کر کے آٹھ نکاتی مطالبات پر سمجھوتہ کیا جاتا۔

معقولیت پسندی کا تقاضہ اب بھی یہی ہے کہ نیتوں کے فتور کو دور کر کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتے۔ اصولی ٹریڈ یونین کارکن ان کوششوں کی پذیرائی کریں گے۔

سپریم کورٹ میں
بھٹو کی اپیل

کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوا ہے

فیصلہ اپنی تردید آپ کرتا ہے

استغاثہ نے ٹھوس شہادتوں
اور شہادتوں کو رد کر لیا

پاکستان سپریم کورٹ میں
حد اختیارات سماعت مرافعہ فوجداری
فوجداری اپیل ۱۱ء ۱۹۷۸ء
ذوالفقار علی بھٹو ولد سر شاہ نواز بھٹو

کوٹ لکھپت جیل ۔
لاہور .... اپیل کنندہ
بنام
مملکت .... مدعا علیہ
اپیل کنندہ ذوالفقار علی بھٹو
بصد احترام عرض گذار ہے ۔

(۱)، مذکورہ بالا اپیل مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء ان کی جانب سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو داخل کی گئی ۔

(۲)، کہ مذکورہ اپیل کی یادداشت کے پیراگراف ۲۳ میں یہ گذارش کی گئی تھی کہ سزائے موت سے بچنے کے لئے سات دن کے اندر اپیل داخل کرنے سے متعلق ہائی کورٹ کی غیر قانونی ہدایت کی تعمیل سے مجبور ہو کر اس مرحلے پر متعینہ مدت کے اختتام سے پہلے ہی درج ذیل عام بنیادی اسباب پیش کئے جاتے ہیں ۔

(۳)، کہ جب یہ اپیل یکم اپریل ۱۹۷۸ء کو سماعت کے لئے پیش ہوئی تو اس معزز عدالت نے از راہ کرم اپیل کنندہ کے اس ادعا کو تسلیم کیا کہ ہائی کورٹ نے جو سات دن کے اندر اپیل داخل کرنے کو کہا ہے وہ غیر قانونی ہے

(۴) کہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو از راہ کرم مزید ہدایت دی کہ اپیل کنندہ اپیل کی سماعت شروع ہونے سے اپیل کے مزید اسباب پیش کر سکتا ہے۔

(۵) کہ اسی لئے درج ذیل اسباب پیش کئے جاتے ہیں۔ اپیل کنندے کی یادداشت مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء میں ان کا اضافہ کر لیا جائے اور انہیں کے ساتھ پڑھا جائے۔

اضافی اسباب

(۱) کہ ہائی کورٹ نے اپیل کنندے کے خلاف جو الزام عائد کیا وہ نہ تو قانونی تھا نہ ہی مناسب۔ عائد کردہ الزام گمراہ کن، متعصبانہ اور الجھن کا نتیجہ تھا کہ سارا مقدمہ باطل ٹھہرتا ہے۔

(۲) کہ اس الزام نے اس کیس کا مناسب اور معقول نوٹس نہیں دیا جس کا کہ اپیل کنندہ کو سامنا کرنا تھا۔

(۳) کہ اس الزام میں ایک جرم تعزیرات پاکستان کی دفعہ نمبر ۳۰۱ کے تحت آتا ہے جس کا اطلاق اپیل کنندے پر نہیں ہو سکتا۔

(۴) کہ اپیل کنندے کو زیر دفعہ نمبر ۳۰۲ بامطالعہ دفعات نمبر ۳۰۱ اور نمبر ۱۱۱ تعزیرات پاکستان مجرم قرار دے کر سزائے موت سنائی گئی ہے لیکن اس پر زیر دفعہ ۳۰۲ بامطالعہ دفعہ ۱۱۱ تعزیرات پاکستان کے تحت کسی جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا ہے۔

(۵) کہ الزام میں ملزم غلام مصطفیٰ کا ذکر نہیں ہے اور مبینہ سازش کے عملدرآمد، اس کے کردار یا احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کے لئے اپیل کنندے کے مبینہ حکم کی بجا آوری کے سلسلے میں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا حالانکہ شہادت کے مطابق اس نے مبینہ طور پر اس سازش کے بروئے کار لائے جانے میں اس نے نہایت ہی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس سے نہ صرف اپیل کنندہ الجھن میں پڑ گیا ہے اور اس کا مقدمہ عصبیت کا شکار ہو گیا ہے بلکہ قطعی طور پر یہ مقدمہ ہی باطل ٹھہرتا ہے۔

(۶) کہ یہ الزام متضاد اور گمراہ کن ہے۔ یہ کہتا ہے کہ "فائرنگ کے نتیجے میں نواب زادہ محمد احمد خاں کا قتل ہوا۔۔۔۔۔ اور تمہاری امداد و اعانت کے نتیجے میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲/۳۴ کے تحت ایک جرم سرزد ہوا اور اس طرح تم ایک ایسا جرم کیا جو زیر دفعہ ۳۰۲/۷ بامطالعہ دفعات ۱۰۹/۷ اور ۳۰۱/۷ تعزیرات پاکستان ایک قابل سزا جرم ہے۔"

(۷) کہ اپیل کنندے کے خلاف ایسا کوئی الزام نہیں کہ اس نے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ ایسی کوئی سازش کی ہو جو نواب زادہ محمد احمد خاں کے قتل پر منتج ہوئی ہو۔ مبینہ سازش کا الزام احمد رضا قصوری کے قتل سے متعلق ہے۔ لہٰذا نواب زادہ محمد احمد خاں کے قتل کے جرم میں اپیل کنندے پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی "امداد و اعانت" کے نتیجے میں یہ قتل ہوا۔

(۸) کہ الزام کی پہلی توجیہہ بھی غیر قانونی اور متعصبانہ تھی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اپیل کنندے نے "وسط ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی کے اس وقت کے ایک ممبر احمد رضا قصوری کو وفاقی سیکورٹی فورس کی ایجنسی کے ذریعہ قتل کرانے کے لئے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ سازش کی تھی" تو یہ الزام بارہ ہزار سے زائد ارکان پر مشتمل ایک بڑی فورس کو اس سازش میں ملوث کر دیتا ہے جبکہ ریکارڈ پر لائی گئی شہادت یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس فورس کے چار یا پانچ ممبروں۔ میاں محمد عباس کے زیر ہدایت، مبینہ سازش کا مقصد پورا کرنے کی کوشش کی جس میں ناکام رہے۔ اس طرح یہ فورس قطعی طور پر اس میں ملوث نہیں ہوتی، تاہم الزام کے نوٹس میں پوری ایف ایس ایف کو ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ کیس باطل ہو جاتا ہے۔

(۹) کہ بنا بریں اس دعوے کی پہلی توجیہہ اس لئے بھی انتہائی گمراہ کن ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ اپیل کنندے نے "وسط ۱۹۷۴ء میں کسی وقت وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش کی تھی"، جو شہادت ریکارڈ پر لائی گئی ہے یہ اس سے متصادم ہے، یہ اپیل کنندے کے لئے حیران کن ہے کیونکہ گواہ استغاثہ کے مطابق مبینہ سازش اپیل کنندے اور مسعود محمود کے پیش رو حق نواز ٹوانہ مرحوم کے درمیان وسط ۱۹۷۴ء سے بہت پہلے ہی تیار کی گئی تھی۔ عائد شدہ الزامات کے پیش نظر یہ شہادت ناقابل تسلیم تھی اور اسے تسلیم کر کے مقدمے کو باطل کر دیا گیا۔

(۱۰) اس طرح الزام کی دوسری توجیہہ کہ مذکورہ بالا مجرمانہ سازش کے مطابق اور آپ کے اشارے پر وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی جانب سے شریک ملزم میاں محمد عباس کو دی گئی ہدایات کے مطابق وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے خود کار ہتھیاروں کے ذریعہ ایک حملے کا اہتمام کیا۔۔۔۔۔" یہ بھی ریکارڈ پر لائی گئی شہادت سے متصادم ہے بہر حال پیش کردہ شہادت یہ تھی کہ مسعود محمود کے پیش رو، میاں عباس کو ایسی ہدایات پہلے ہی دے چکے ہیں اور مسعود محمود سے کہا گیا تھا کہ وہ اسے یہ ہدایات یاد دلا دے۔ یہ شہادت بھی ناقابل تسلیم ہے اور اس طرح یہ الزام انتہائی گمراہ کن اور متعصبانہ تھا اور یہ مقدمہ باطل ٹھہرتا ہے۔

۱۱۔ کہ زیر دفعہ نمبر ۱۲۰۔بی تعزیرات پاکستان بامطالعہ دفعہ نمبر ۱۱۵ تعزیرات پاکستان کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا لیکن اپیل کنندے کو غیر قانونی طور پر تعزیرات پاکستان کی ان دفعات کے تحت ایک جرم کا مرتکب اس بنا۔ پر قرار دیا گیا ہے کہ نواب زادہ محمد احمد خان کے قتل کے بعد بھی سازش چلتی رہی ان الزامات کے ثبوت کے لئے اپیل کنندے کو کوئی نوٹس نہیں دیا گیا

(۱۲) کہ الزام کی تیسری توجیہہ بھی وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو اوپر الزام کی پہلی اور دوسری توجیہات کے سلسلے میں اٹھائے جا چکے ہیں۔

۱۳۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ کا یہ کہنا غلط ہے کہ تمام جرائم جن کا الزام ملزم پر عائد کیا گیا ہے پوری طرح ثابت ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوا ہے جو شہادت پیش کی گئی وہ عائد کردہ الزامات سے مختلف کہانی ظاہر کرتی ہے اور وہ قابل تسلیم نہیں ہے اور عدالت کو اس پر دھیان نہیں دینا چاہئے تھا۔

۱۴۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ نے یہ کہہ کر غلطی کی ہے کہ احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش نواب محمد احمد خان کی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہی چونکہ احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ سازش کی سزا کا کیس دفعہ ۱۲۰۔بی بامطالعہ حصہ اوّل دفعہ نمبر ۱۱۵ تعزیرات پاکستان کے تابع ہے"۔ اس بارے میں یہ گذارش کی جاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اسے ثابت کرنے کے لئے کوئی شہادت بھی موجود نہیں تھی اس لئے اپیل کنندے کو ان الزامات کا مجرم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک طرف تو اپیل کنندے کو اس بناء پر مجرم قرار دیا گیا ہے کہ سازش ۱۱۔ نومبر ۱۹۷۴ء کے بعد بھی جاری رہی۔ دوسری طرف سماعت کرنے والی بنچ خود ہی اس کے پہلے پیرا نمبر ۵۲۳ میں کہہ چکی ہے کہ سازش ناکام ہونے کے بعد احمد رضا خان قصوری کو پیپلز پارٹی کے حلقے میں لانے کی کوششیں کی گئیں اس سلسلے میں گذارش کی جاتی ہے کہ سازش کو بیک وقت ناکام اور جاری دونوں نہیں کہہ سکتے لہٰذا یہ فیصلہ اپنی تردید آپ کرتا ہے سازش کا جاری رہنا ریکارڈ پر لائی گئی شہادت کے خلاف ہے۔

۱۵۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ نے اپیل کنندے کو زیر دفعہ نمبر ۱۲۰ بی نمبر ۳۰۲ بامطالعہ دفعہ نمبر ۳۰۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان اور دفعہ نمبر ۱۰۹ اور نمبر ۱۱۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان مجرم قرار دے کر بھی غلطی کی ہے۔ سماعت کرنے والی بنچ اپیل کنندے کو ان جرائم کے لئے قانوناً مجرم قرار نہیں دے سکتی۔ خاص طور پر دفعہ نمبر ۳۰۱ بامطالعہ دفعہ نمبر ۱۱۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان کے تحت جرائم کا مجرم قرار نہیں دے سکتی۔

۱۶۔ کہ اسی طرح اپیل کنندے کے زیر دفعہ ۳۰۷ بامطالعہ دفعہ ۱۰۹ ضابطہ تعزیرات پاکستان مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۷۔ کہ جرمانہ عائد کرنا بھی غیر قانونی ہے۔

۱۸۔ کہ نتیجتہً تمام سزائیں غیر قانونی اور ناقص ہیں اور منسوخ کئے جانے کی مستحق ہیں۔

۱۹۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ کی یہ دریافت کہ اپیل کنندے پر جن جرائم کے الزامات عائد کئے گئے ہیں وہ بیّن طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ غلط اور گمراہ کن ہے استغاثہ ان الزامات کو ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ استغاثہ نے جو گواہیاں پیش کی ہیں وہ متناقض اور قطعی ناقابل اعتبار ہیں اور خود استغاثہ کے گواہوں کے ذریعہ ہی یہ مقدمہ اور اس کا ایک ایک نکتہ زائل ہو چکا ہے۔

استغاثہ کی طرف سے اصل واقعہ دو تین طرح سے بیان کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں

یہ ہے سیاست مولویو!

فیصلہ مدیر جسارت کا، دستخط حکومت اور نام نہاد لیڈروں کے

جسارت کے مدیر "بنیادی حقوق" کے مصنف، ردّی پلانٹ کے وظیفہ خوار اور جماعت اسلامی کے تنخواہ دار کارندے مولوی صلاح الدین بالآخر صحافیوں کی نام نہاد مذاکراتی ٹیم کے ذریعہ حکومت پر کمبل ڈالنے میں اپنے طور پر کامیاب ہو گئے۔ "بنیادی حقوق" کے چیمپئن صحافیوں کو بنیادی حقوق سے محروم کرنے اور حق کا گلا گھونٹنے کے لئے جسارت کے صفحات اور ادارتی کالموں میں جدوجہد کے آغاز ہی سے خنجر بدست لپک جھپک دکھا رہے تھے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی لمحے چور دروازے سے داخل ہو کر منافقت اور رقابت کا لہراتا خنجر حق پرستوں کی پیٹھ میں گھونپ دیں گے۔ ہمارے یہ خدشات درست ثابت ہوئے۔ نام نہاد مذاکراتی ٹیم پوری طرح ایکسپوز ہو چکی تھی کہ اچانک ۲۸ مئی کو مدیر جسارت مولوی صلاح الدین راتوں رات کراچی سے لاہور کے فلیٹیز ہوٹل پہنچے۔ جہاں اینک کے برطرف نائب صدر رشید چودھری کو کمرہ نمبر ۳۴ میں ٹھہرایا گیا تھا اور جن کے خرچے بھاڑے اور دیگر جملہ اخراجات حکومت کسی نہ کسی کھاتے میں برداشت کرے گی۔ ظاہر ہے کہ غداری کا صلہ کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ کس کی قیمت کتنی لگتی ہے۔

مولوی صلاح الدین احکامات حاصل کرنے کے لئے جماعت کے ہیڈ کوارٹر المنصورہ بھی گئے۔ اور وہاں سے ہدایات لے کر دوسرے دن یعنی ۲۹ مئی کے مذاکرات کے پول میں دھنس گئے۔ ان کی پُر اسرار آمد اور مذاکرات میں جوتوں سمیت گھسنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ حکومت اور نام نہاد مذاکراتی ٹیم کے درمیان اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پہلے سے تیار شدہ "سمجھوتے" پر راضی نامہ کرا دیں۔ بظاہر ان کی یہی کوشش تھی کہ نام نہاد مذاکرات پر حقیقت کا گمان ہو، مگر مولوی صلاح الدین کے گھس بیٹھے کارندوں اور ٹھیکیدار محمود جعفری، رشید صدیقی، رشید چودھری اور نسیم الحق عثمانی نے اپنی اکثریتی برادری حقیقی نمائندوں اور تحریک سے غداری کے کھیل نے مذاکراتی کھیل کا رنگ بگاڑ دیا۔ مذاکرات کے نتیجے اور فیصلے کی صورت میں جو باتیں سامنے آئیں ان سے پتہ چل گیا کہ فیصلہ وہی ہوا جو مولوی صلاح الدین اور حکومت چاہتی تھی۔ مساوات لاہور کا مشروط اجرا خود کو ٹریڈ یونین لیڈر کہلوانے والوں کے چہرے پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے وہ اپنے خون سے بھی دھو نہیں سکتے۔

ہمیں جسارت، جماعت اسلامی اور مولوی صلاح الدین سے کوئی شکایت نہیں کہ ان کے ضمیر مردہ، قلب سیاہ اور کارکنوں کے مفادات سے غداری ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ۱۹۷۰ء کی اخباری کارکنوں کی عظیم ہڑتال میں یہی گھناؤنا رول ادا کیا اور آج بھی جب اخباری صنعت کے کارکنوں کی اکثریت اپنے آٹھ نکاتی مطالبات کی حمایت میں باہر نکلی تو جماعت اسلامی اور اسی کے ایجنٹوں نے اپنی روایت پر چلتے ہوئے ایک بار پھر لبنی چھرا گھونپ کر ثابت کر دیا کہ بچھو کا کام ڈنک مارنا ہے۔ چاہے آپ اس کی دودھ سے ہی خاطر تواضع کیوں نہ کریں۔ جب بھی موقع ملے گا، ڈنک ہی مارے گا۔ جیسے کہ بنیادی حقوق کے چیمپئن نے بنیادی حقوق ہی کو ڈس لیا ہے۔

(۲) سازش سے متعلق بھی استغاثہ کا مقدمہ ناکام ہو چکا ہے۔ بینہ سازشیوں کے درمیان رائے کی یکسانیت باتفاق ہمت نہ ہونے کے باعث یا کسی اور طرح سازش کا ہونا از روئے قانون ثابت نہیں کیا جا سکا ہے سازش سے متعلق بھی استغاثہ کے بیانات باہمی متصادم اور متناقض ہیں

(۳) استغاثہ وقتاً فوقتاً اپنی بنیاد تبدیل کرتا رہا ہے اور تفتیش نیز مقدمے کے دوران مقدمے کے مادّی پہلوؤں سے متعلق مختلف نظریات اختیار کرتا رہا ہے مثال کے طور پر گولہ بارود کے ماہر نے جب اپنی رپورٹ کے ذریعہ یہ کہہ کر استغاثہ کے کیس کو منہدم کر دیا کہ جن بندوقوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مبینہ طور پر اس جرم کے ارتکاب میں استعمال کی گئی تھیں وہ فی الحقیقت اس میں استعمال نہیں کی گئی تھیں تو ارتکاب جرم کے خولوں کی تبدیلی کا نظریہ اختراع کیا گیا۔ استغاثہ کے گواہوں نے اپنی شہادتیں قلمبند کرانے کے دوران اپنی شہادت کی ٹھوس تفصیلات میں تبدیلیاں کیں اور اپیل کنندہ کے جس کی اطلاع ان کے سابقہ بیانات سے ملی تھی انہوں نے اس کے برعکس ایک اور ہی مقدمہ تیار کر دیا۔

(۴) استغاثہ کے گواہوں نے اپنی شہادتوں میں جو اصلاحات کیں وہ اتنی بنیادی اور اہم تھیں۔ کہ کوئی بھی عدالت ان شہادتوں کو قابل اعتماد مان کر کسی شخص کو بھی کسی جرم کے لئے سزا نہیں دے سکتی تھی۔ چہ جائیکہ ایسے جرم کے لئے جس کی سزا جسمانی ہو۔

(۵)۔ استغاثہ نے ٹھوس شاہدوں اور شہادتوں کو روک لیا اور کچھ ایسے گواہ پیش کر دیئے جس کے نام ۱۱ ستمبر ۱۹۷۷ء کے چالان میں قطعی درج نہیں تھے۔

(۶) استغاثہ کے پیش کردہ تمام گواہ صرف ایک مستغیث (گواہ استغاثہ نمبر ۱) کے سوا سرکاری ملازمین یا سبکدوش سرکاری ملازمین تھے۔ جن میں سے بیشتر نظر بند یا دباؤ کے شکار رہ چکے تھے۔

(۷) تقریباً تمام گواہوں کو ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت بیان قلمبند کرا کر اس طرح بند کر لیا جاتا کہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر فائز افسر پر بھی یہ اعتماد نہیں کیا جاتا کہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اپنا بیان قلمبند کرائے بغیر شہادت دے سکے۔ اس کے باوجود مذکورہ افسر کو دوسرے گواہوں کی طرح مجبور کیا جاتا کہ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اس نے جو گواہی دی ہے اس میں ضروری اصلاحات کرے تاکہ استغاثہ کے کیس میں کئے جانے والے رد و بدل سے مطابقت ہو سکے۔

۸۔ گواہ اپنے بیانات میں جو اہم اصلاحات کرتے ان کی توضیح کرنے کے لئے یہ کہنا سکھایا جاتا کہ جب ان کے بیانات کے اندر ٹھوس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ کہہ دیں کہ ہمیں یاد نہیں یہ سابقہ بیانات عام طور پر ان کے عدالت میں حاضر ہونے سے محض مہینہ دو مہینہ پہلے لئے جاتے پھر بھی عدالت ان کی اس نام نہاد توضیح کو جائز قرار دے دیتی جب کہ اسی گواہ کے متعلق یہ حقیقت تسلیم کی جاتی کہ اس نے تین سال پہلے جو کچھ دیکھا یا سنا تھا۔ اس کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی۔

(۹) وہ واحد گواہ جسے غیر جانبدار کہا جا سکتا تھا پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر محمد حنیف رامے تھے ان کے متعلق استغاثہ نے صفائی کو بتایا تھا کہ انہیں پیش کیا جائے گا۔ لیکن آخری لمحات میں انہیں یہ جھوٹا عذر تراش کر ترک کر دیا گیا کہ انہیں رام کر لیا گیا ہے۔ دوسرے غیر جانبدار گواہوں کو جن کے نام فہرست میں موجود تھے سرے سے پیش ہی نہیں کیا گیا۔

(۱۰) کہ استغاثہ کے تمام گواہ اپنی شہادت کے مطابق شرکاء جرم کے درجے میں آجاتے ہیں۔ جن کی شہادت مزید تائیدی شہادت کے بغیر قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی نہ ہی ایسی کوئی نا سد شہادت کسی ایسی ہی دوسری شہادت کی مزید تائید کے طور پر قبول کی جا سکتی تھی۔

(۱۱) کہ مارشل لاء کی حکومت نے سرکاری ذرائع ابلاغ اور اخبارات کے ذریعہ جو معاندانہ ماحول پیدا کر دیا تھا اس سے خائف ہو کر ناروا ترغیب پا کر یا کسی اور طرح بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر ماتحت یا اعلیٰ سرکاری حکام جھوٹی گواہی دینے پر مجبور تھے تاکہ اپیل کنندے کو ختم کرنے سے متعلق مارشل لاء حکومت کا مقصد پورا ہو سکے۔ ان میں سے بعض گواہوں سے یہاں تک کہلوایا گیا کہ مارشل لاء نافذ ہونے سے پہلے وہ سچی شہادت دینے کے لئے آزاد نہیں تھے۔ اس جبر اور دباؤ کی فضا میں اپنی تحقیر آپ کرنے والے ان گواہوں کے متعلق یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سچ بولیں گے۔

(۲۰) اول۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین کی صدارت میں مقدمہ کی سماعت کرنے والی بنچ نے جو اپیل کنندے کے خلاف رجحان و تعصب سے متاثر تھی۔ ایک انتہائی جانبدار مستغیث کے فرائض انجام دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جو شہادت اپیل کنندے کے لئے قابل قبول اور اس کے حق میں تھی اسے غیر قانونی اور جابرانہ طریقے سے روک دیا گیا اور جو شہادت ناقابل قبول لیکن اپیل کنندے کے حق میں مضرت رساں تھی اسے وکیل صفائی کے اعتراض کے باوجود ریکارڈ پر لایا گیا۔

(دوم) کہ شہادت کے ریکارڈ کو کھلی عدالت میں اس طرح نک سکھ سے درست کیا گیا اور جوڑ پہ جوڑ بٹھا کر تیار کیا گیا کہ استغاثہ کے کیس کے حسب حال ہو جائے۔ سماعت کرنے والی بنچ کے تبصرات نے گواہوں کے ذہن میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنے دیا کہ کس قسم کی شہادتوں کو ریکارڈ میں لانے کی ضرورت ہے۔

(سوم)۔ جملہ ہائے معترضہ جن سے استغاثہ کی مہم میں اعانت ہوتی ہے ریکارڈ کی صورت سے نمایاں ہیں۔

(چہارم)۔ گواہوں کے سابقہ بیانات اور شہادتوں کے درمیان صفائی کی جانب سے جو تضادات اجاگر کئے گئے انہیں ریکارڈ میں نہیں لایا گیا۔

(پنجم)۔ گواہان استغاثہ کی سچائی کو پرکھنے یا ان کی ساکھ کو متزلزل کرنے والے سوالات کرنے یا ریکارڈ میں لانے کی اجازت نہیں دی گئی یا اگر ریکارڈ میں لایا بھی گیا تو انہیں مسترد کر دیا گیا اور ایسے سوالوں کے جوابات ریکارڈ پر لانے کی اجازت نہیں دی گئی

(ششم) ٹھوس تضادات کی حد تک فروگذاشت سے متعلق گواہوں سے کچھ پوچھنے کی اجازت اس بنا پر نہیں دی گئی کہ ایسے سوالات کہ آیا یہ فروگذاشت تضاد کی حد تک ہے یا نہیں آخری دلائل کے مرحلے پر طے کئے جائیں گے۔ آخری

دلائل کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے (پیرا ۲۰) میں لکھا ہے کہ بعض فروگذاشت کا تضادات کی حد تک ہونا ممکن ہے لیکن سماعت کرنے والی بنچ کی اس رولنگ کا اس کے فیصلہ سنا دینے کے بعد کسی ملزم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، بہرحال موجودہ کیس میں ایسی ایک بھی فروگذاشت نہیں جس کے متعلق سمجھا جائے کہ اس میں عدم مطابقت یا تضاد بیانی کا زور ہے جس سے استغاثہ کے کسی گواہ کی ساکھ پر اعتراض کیا جا سکے۔

(۲۱) (الف) کہ جب کسی گواہ کی توجہ اس کے سابقہ بیان کی کسی ٹھوس فروگذاشت کی طرف مبذول کرائی گئی اور اس نے کہہ دیا کہ مجھے یاد نہیں تو اس کے ایسا کہنے کو سماعت کرنے والی بنچ نے ایک جائز توضیح تسلیم کیا۔ استغاثہ کا یہی طرز عمل رہا ہے، اس نے تقریباً تمام اہم گواہوں کو یہ سکھا دیا تھا کہ تضادات کو کیس کے ریکارڈ پر لانے سے بچنے کے لئے یہی جواب دیا کریں۔ سماعت کرنے والی بنچ، مقدمے کے ابتدائی مراحل میں یہ رائے ظاہر کر چکی تھی کہ جب کوئی گواہ یہ کہے کہ اسے یاد نہیں کہ آیا اس نے اپنے سابقہ بیان میں کوئی خاص بات کہی تھی یا نہیں تو اسے اپنے سابقہ بیان کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا اور نہ اس کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے اس کا سابقہ بیان اسکے سامنے لایا جائے گا کیونکہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ سماعت کرنے والی بنچ نے مزید کہا کہ صرف اس وقت جبکہ کوئی گواہ اپنے سابقہ بیان میں کہہ چکا ہو کہ اسے کوئی خاص حقیقت یاد ہے لیکن گواہ کے کٹہرے میں آ کر کہہ دے کہ اسے یاد نہیں تو اسے تضاد کہا جائے گا۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

(ب) گواہان استغاثہ کے سابقہ بیانات میں جو انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کے سامنے ریکارڈ کرائے ہیں متعدد ٹھوس فروگذاشت موجود ہیں۔ جب ان میں سے چند فروگذاشت کی طرف سماع بنچ کی توجہ مبذول کرائی گئی تو یہ فیصلہ دیا گیا کیونکہ گواہ جواب میں یہ کہہ چکے ہیں کہ آیا انہوں نے اپنے سابقہ بیان میں ایسا کہا تھا یا نہیں، یاد نہیں اس لئے اس میں کوئی تضاد نہیں۔

(ج) سماع بنچ نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی گواہ اپنے سابقہ بیان کی کسی ٹھوس فروگذاشت کی تشریح یہ کہتے ہوئے کر دیتا ہے کہ اس کی شہادت میں کی جانے والی یہ اصلاح مستغیث کی جانب سے کئے جانے والے مخصوص سوال کی بنا پر کی گئی ہے تو یہ کوئی تضاد نہیں، یہ جوابات، ان حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی جن میں یہ اصلاحات کی گئیں، ناقابل دفاع تھے۔ مستغیث امکانی طور پر ایسے سوالات کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ قانون کے تحت اسے اپنے گواہوں سے ایسے سوالات کرنے کی اجازت تھی۔

(د) سماع بنچ نے اپنے آخری فیصلے میں کہا ہے کہ گواہوں کی شہادتوں میں ہونے والی اصلاحات محض تفصیلی امور ہیں لہٰذا تضادات کی حد تک نہیں ہیں۔ تاہم یہ معزز عدالت بخوشی یہ دریافت کرے گی کہ سماع بنچ کی بیشتر اہم تحقیقات کی بنیاد یہی اصلاحات ہیں۔ اور جو اہم سوالات ملزمان سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری کئے گئے تھے وہ بھی انہیں فروگذاشت اور اصلاحات پر مبنی تھے جن پر سماع بنچ اعتماد نہ کر سکی، اس معزز عدالت کی توجہ بہت ساری مثالوں میں سے درج ذیل چند مثالوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے:

(اوّل) گواہ استغاثہ ۲ مسعود محمود نے عدالت میں اپنے بیان (ص ۲۳) میں کہا:

" میں میاں محمد عباس سے کہتا رہا تھا کہ وہ مسٹر ویلچ سے ان اقدامات سے متعلق دریافت کریں جو انہوں نے مسٹر احمد رضا قصوری سے متعلق انہیں دی گئی ہدایات کے مطابق انہوں نے کئے ہوں۔ اس دستاویز میں دیئے گئے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر ویلچ اپنا فرض انجام نہیں دے سکے تھے۔"

انہوں نے اپنے دو سابقہ بیانات میں سے کسی میں بھی اس کا حوالہ نہیں دیا تھا کہ سماع بنچ نے اس اصلاح کو اپیل کنندے کے خلاف ایک اہم امدادی شہادت کے طور پر قبول کیا ہے جیسا کہ فیصلے کے پیرا ۴۶۶ تا ۴۶۸ سے ظاہر ہوتا ہے۔

(دوم) گواہ استغاثہ نمبر ۲ مسعود محمود نے اپنی شہادت کے صفحہ ۴۷ پر یوں لکھا ہے۔

"۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو میں ملتان میں تھا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بھی وہیں تھے۔ انہوں نے صبح تڑکے مجھے فون کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تمہارے میاں عباس نے صورتحال کو گول کر دیا۔ مسٹر احمد رضا قصوری کے بجائے اس کے باپ کو مروا ڈالا، مجھے حیرت ہوئی۔ وزیراعظم نے یہ کہہ کر ٹیلی فون رکھ دیا کہ میں بعد میں تمہیں طلب کرونگا۔ اس کے بعد مجھے ملتان میں مسٹر صادق حسین قریشی کے مکان پر بلوایا جہاں مجھے مسٹر بھٹو کے سامنے لے جایا گیا۔ مسٹر بھٹو نے مجھ سے انتہائی لاتعلقی سے کہا جیسے کہ پہلے ان سے اس سلسلے میں میری بات ہی نہ ہوئی ہو، میں نے سنا ہے کہ کل رات لاہور میں کسی جگہ مسٹر احمد رضا قصوری کے والد کا قتل ہو گیا ہے، میں نے جواب دیا کہ میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔"

اس گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانوں میں جو زیر دفعہ ۱۶۴ ضابطہ فوجداری قلمبند کئے گئے تھے، کہیں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا تھا۔ اپیل کنندے سے سوال ۴۴ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری انہیں اصلاحات سے متعلق کیا گیا تھا اور سماع بنچ نے ان اصلاحات کو اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۵۸

(سوم) گواہ استغاثہ ۲ مسعود محمود نے اپنی شہادت کے صفحہ ۵ میں یوں کہا:

میں نے ان سے کہا "آپ کے اشارے پر

آپ کا تیار کردہ ایک تصور عمل میں لایا گیا اور اس کا پیغام میں نے میاں عباس کو پہنچایا جسے پہلے ہی میرے پیش رو کے ذریعے آپ کی ہدایات مل چکی تھیں اور یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ میں اور آپ دونوں اور میرے ماتحت لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے لیکن اب ایسے کسی اور حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔"

یہ بات بھی ان کے سابقہ بیانات میں نہیں کہی گئی تھی (ملاحظہ ہو ص ۱۹۹) سوال ۵۴ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری ۔ اسی بیان کی بنیاد پر تشکیل اور اپیل کنندہ کو پیش کیا گیا تھا اور اپیل کنندہ کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۵۹ میں اسی پر توجہ دی گئی ہے

(چہارم) گواہ استغاثہ ۲ مسعود محمود نے صفحہ ۱۰۳ پر کہا ہے :

" اگست ۱۹۷۴ء میں مسٹر احمد رضا قصوری پر اسلام آباد میں حملے کے بعد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے یاد دلایا کہ کوئی واضح بات ہو نہیں سکی (کچھ نہیں ہوا) ان کا اشارہ محذوف تھا ۔ میں نے میاں عباس کو یاد دلایا اور انہوں نے کہا حکم کی تعمیل ہوگی ، لہٰذا اس سے بھی میری تائید ہوتی ہے "۔

ان الزامات کا کوئی ذکر ان کے کسی سابقہ بیان میں نہیں تھا تاہم اپیل کنندہ سے ان کی جرح کے دوران انہیں الزامات پر مبنی سوال ۳۰ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری پوچھا گیا جو اپیل کنندہ کے حق میں سخت مضرت رساں تھا ۔

(پنجم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ سعید احمد کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۱۲ میں یوں کہتے ہیں :-

" خط نمبر پی ڈبلیو ۳/۳ سی پاکر میں الجھن میں پڑ گیا کیونکہ ان میں مذکور تھا کہ چینی اسلحہ ایف ایس ایف کے استعمال میں ہیں ۔ اور مجھے وزیراعظم نے مثبت ہدایات دی تھیں کہ ایف ایس ایف کا نام الگ رکھا جائے ، میرے پاس وزیراعظم کے پاس واپس جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا اور میں نے ان سے ملاقات کرکے انہیں سیکریٹری دفاع کا یہ ڈی او لیٹر دکھایا اور پوچھا کہ کیا یہ خط ٹریبونل میں پیش کیا جائے ۔ اس پر مسٹر بھٹو مشتعل ہو کر بولے " میں نے تمہیں اپنے تحفظ کے لئے بھیجا ہے یا مجھے الزام میں ملوث کرنے کے لئے ؟ یہ خط یقیناً ٹریبونل میں پیش نہیں کیا جائے گا ۔ تم حد سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو ۔ اگر تم نے اپنا رویہ درست نہیں رکھا تو نتائج بھگتو گے جسے تمہاری اولاد بھی فراموش نہیں کر سکے گی "۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ اتنا اہم بیان بھی ان کے سابقہ بیانات میں کہیں موجود نہیں تھا ۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ سعید احمد خاں جیسا ایک آدمی اپنے دونوں سابقہ بیانات میں اس کا ذکر کرنے سے رہ جاتا تاہم اسی جھوٹے بیان پر مبنی ایک سوال اپیل کنندہ سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری بطور سوال ۲۵ کے کیا گیا اور میرے خلاف فیصلے کے پیرا ۸۴ میں اس پر اعتماد کیا گیا ہے ۔

(ششم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ سعید احمد نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۱۹ میں مزید کہا :

" اس پر احمد رضا قصوری گھوم کر رخ بدلتے ہوئے بولے کہ میں اس پارٹی میں کیونکر شریک ہو سکتا ہوں جس کا چیئرمین زیڈ اے بھٹو ہے جو جو میرے باپ کے قتل کا ذمہ دار ہے اور میرے خون کے درپے ہے ۔ میں نے کہا کہ یہی تو اور بھی بڑی وجہ ہے کہ آپ مسٹر بھٹو سے بنا کر لیں اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ ایک معروف آدمی ہیں ۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ ایک ہونہار جوان آدمی ہیں ، ایک مستقبل رکھتے ہیں اگر آپ دوبارہ پی پی پی میں شریک ہو جاتے ہیں تو دوبارہ سرفراز ہو سکتے ہیں ۔ اس پر مسٹر احمد رضا قصوری نے کہا کہ مجھے اس پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت دیا جائے ۔ کئی دنوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آکر کہنے لگے کہ تمہاری رائے مستحکم ہے تم وزیراعظم کو مطلع کر سکتے ہو کہ میں پی پی پی میں شمولیت اختیار کرنے کو تیار ہوں اور مسٹر بھٹو سے ملنا پسند کروں گا "

یہ بیان اپنی صورت ہی سے غیر معقول معلوم ہوتا ہے یہ ممکن نہیں کہ وزیراعظم کا چیف سیکورٹی آفیسر حکومت کے ایک مخالف سے ایسی باتیں کرے ۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے سابقہ بیانات میں سے کسی میں بھی یہ الزامات عائد نہیں کئے ..... تھے مگر سوال نمبر ۲۶ انہیں پر مبنی تھے جو اپیل کنندہ سے زیر دفعہ نمبر ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری پوچھا گیا اور سامع بنچ نے فیصلے کے پیراگراف نمبر ۹۲ اور نمبر ۵۲ میں اپیل کنندہ کو جرم میں ملوث کرتے ہوئے انہیں کا حوالہ دیا ہے اور انہیں پر بھروسہ کیا ہے

(ہفتم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ ایم آر ویلچ نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۸۱ میں یوں کہا ہے ۔

" میں ایک گھناؤنا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور مسٹر مسعود محمود کے احکامات کو عمل میں نہ لانے کے لئے کوئی معقول عذر پیش کر دینا چاہتا تھا ۔ میں نے اس حقیقت کا سہارا لیا کہ مسٹر احمد رضا قصوری اچھی طرح تحفظ میں ہوتے ہیں ۔ میں نے اسی کو اپنا عذر بنایا مجھے امید تھی کہ مسٹر مسعود محمود اس کا مفہوم سمجھ جائیں گے اور ان احکامات پر میرے عمل نہ کرنے کی وجہ معلوم کر لیں گے "۔

یہ سب انہوں نے اپنے سابقہ بیان میں نہیں کہا تھا سامع بنچ نے اس اصلاح کا حوالہ دیا ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے جیسا کہ اپیل کنندہ کے خلاف فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۱ ، نمبر ۸۰ ، اور ۸۳، ۸۴ سے ظاہر ہوگا ۔ اتفاق سے اس معزز عدالت کو یہ جان کر مسرت ہو سکتی ہے کہ یہ گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ کے بیان میں یہ اصلاح گواہ استغاثہ نمبر ۲ کی ایک ایسی ہی اصلاح کی تائید کے لئے کی گئی تھی ۔ جیسا کہ اوپر ان میں حوالہ دیا جا چکا ہے اور سامع بنچ نے اس کو اسی طور پر اختیار کیا ہے ۔

(ہشتم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ محمد اصغر نے عدالت میں اپنی شہادت کے صفحہ ۳۶۲ میں یوں کہا ہے ۔!

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے دو یا تین دن بعد کی بات ہے کہ جب میں سول پولیس اسٹیشن میں ڈی آئی جی، سردار عبدالوکیل کے ساتھ بیٹھا تھا کہ مسٹر عبدالحمید باجوہ آئے انہوں نے پھر یہی کہا کہ مسٹر بھٹو کے نام کو الگ رکھا جا سکتا ہے میرے ڈی آئی جی اور میں نے ان سے کہا کہ یہ ممکن نہیں انہوں نے ڈی آئی جی سے ان خولوں کے متعلق دریافت کیا جو جائے وقوع پر ملے تھے ڈی آئی جی نے انہیں بتایا کہ انہیں معقول طور پر سر بمہر کر دیا گیا ہے۔ مسٹر عبدالحمید باجوہ نے ریمارک کیا کہ ان خولوں کو سر بمہر کرنے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے ان خولوں سے متعلق کیوں پوچھا تھا"

اس گواہ نے زیر دفعہ نمبر ۱۶۱ ضابطہ فوجداری اپنے بیان میں اس کہانی کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا تھا تاہم یہ سب کچھ اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف نمبر ۲۱۲ میں استعمال کیا گیا ہے۔

(نہم) شہادت کے ریکارڈ کے صفحات ۳۶۰، ۳۵۹ میں گواہ استغاثہ محمد اصغر نے یوں کہا۔

"مسٹر قصوری کچھ جذباتی ہو گئے اور کہا کہ میرے خیال کے مطابق حقیقی مجرم بھٹو ہے اور جب تک اس کا نام ایف آئی آر میں درج نہیں کیا جاتا تب تک میں اس کیس کا اندراج نہیں کروں گا میں نے اُن سے استدعا کی کہ وہ اپنا تحریری بیان دیں اسی کو ایف آئی آر میں پیش کر دیا جائیگا"

انہوں نے یہ سب کچھ اپنے بیان زیر دفعہ ۱۶۱ ضابطہ فوجداری میں ذکر نہیں کیا تھا پھر بھی سامع بنچ نے اسے فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱ میں اپیل کنندے کے خلاف ایک شہادت کے طور پہ قبول کیا ہے۔

(دہم) اسی طرح گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ محمد اصغر نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۶۱ میں یوں کہا ہے :۔

"۱۱۔ نومبر ۱۹۷۴ء کی شام کو آئی جی کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی اس میٹنگ میں میرے علاوہ آئی جی پولیس، عبدالحمید باجوہ، اس وقت کے ڈپٹی کمشنر اور ڈی آئی جی پولیس نے شرکت کی تھی۔ آئی جی نے مجھے حکم دیا کہ نواب محمد احمد خان کی لاش ان کے مکان سے ہٹا کر کہیں دفن کر دی جائے مجھ سے توقع کی گئی کہ اس حکم کی تعمیل رات کے وقت کروں گا۔ اس وقت راؤ عبدالرشید خان انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے۔ میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ آئی جی پولیس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر کوئی بات ہو گئی تو دوسرے دن مجھ سے باز پرسی ہو گی۔ مجھے اُس سے جگہ سے چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔"

قطع نظر اُس کے کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس کو گواہ استغاثہ کے طور پر کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ نے یہ جھوٹی باتیں اپنے سابقہ بیانات میں نہیں کہی تھیں۔ تاہم انہیں اپیل کنندے کے خلاف شہادت کی حیثیت دی گئی۔ انہیں بیانات کی بنیاد پر سوال نمبر ۴۳ تشکیل دیا گیا تھا اور اپیل کنندے سے پوچھا گیا تھا یہ بیانات فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۲ میں اپیل کنندے کے خلاف بطور شہادت اختیار کئے گئے ہیں۔

(یازدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ عبدالوکیل خان ڈی آئی جی پولیس نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۸۴ میں یوں کہا :۔

"میں جانتا تھا کہ عبدالحمید باجوہ ایف ایس ایف سے قریبی تعلق رکھتے تھے اسی لئے میں خولوں سے نمٹنے سے متعلق کسی بھی تجویز سے میں انہیں الگ رکھنا چاہتا تھا تاکہ ایف ایس ایف کو بری الذمہ رکھا جائے۔"

انہوں نے دفعہ ۱۶۱ ضابطہ فوجداری کے تحت اپنے بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس غلط بیان پر اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۲۱۲ میں اعتماد کیا گیا ہے۔

نوٹ : عبدالوکیل خان کا مذکورہ بالا بیان وہ متن ہے جس کی قائم مقام چیف جسٹس نے مزید اصلاح کر دی ہے تاکہ اپیل کنندے کے خلاف مزید ضرر رساں ہو جائے جیسا کہ اپیل کنندے کی درخواست مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء میں کہا جا چکا ہے)

(دوازدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ سردار عبدالوکیل خان نے اپنی شہادت کے صفحہ ۳۸۵ میں کہا ہے:

"مجھے یاد ہے مسٹر احد نے تقریباً دو ہفتے کے بعد مجھ سے ملاقات کی اس وقت میں نے ان سے پوچھا کہ بالسٹک اکسپرٹ کو خول بھیجے گئے تھے کیا اس کا کوئی نتیجہ معلوم ہوا ہے مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے ان خولوں کے بھیجنے میں تاخیر کر دی تھی۔ کیونکہ ان خولوں کو مسٹر عبدالحمید باجوہ لے گئے تھے پھر انہوں نے دو تین دنوں کے بعد واپس کئے اس کے بعد ان خولوں کو جانچ پڑتال کے لئے بھیجا گیا۔ میں مسٹر احد پر خفا ہوا اور پوچھا کہ آپ نے ان خولوں کو مسٹر عبدالحمید باجوہ کے حوالے کیوں کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مسٹر باجوہ نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے کہا تھا کہ ان خولوں کو پرائم منسٹر ہاؤس لے جایا جائے گا جہاں اعلیٰ احکام کو دکھایا جائے گا۔ میں نے اسی دھمکی کی وجہ سے وہ خول ان کے حوالے کر دیئے۔"

اس عجیب و غریب من گھڑت کہانی کا ان کے سابقہ بیان میں جو انہوں نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت یا ضابطہ فوجداری کی دفعہ نمبر ۱۶۴ کے تحت دیا تھا کہیں کوئی ذکر نہیں تاہم اس گواہ کی اس بعد از وقت اصلاح کو سامع بنچ کے فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۸ نمبر ۳۱۴ اور نمبر ۴۲۴ میں اپیل کنندہ کو ملوث کرنے والی ایک شہادت کے طور پہ قبول کیا گیا ہے۔ ان الزامات کی بنیاد پر اپیل کنندے سے ضابطہ فوجداری کے تحت کوئی سوال تک نہیں پوچھا گیا۔

(سیزدہم) پھر یہی اعلیٰ منصب پولیس افسر اپنی شہادت کے صفحہ ۳۸۷ میں کہتا ہے۔

"اس نے (مسٹر باجوہ) مجھ سے خاص طور پر ان خولوں سے متعلق دریافت کیا جو جائے وقوع پر پائے گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ جائے وقوع پر پائے جانے والے خول ۷۶۲ء ایم ایم کیلیبر کے تھے۔"

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

یحییٰ بھی بولے .....

• روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔

• نادر شاہ درانی ہندوستان پر حملہ کر چکا تھا اور اُس کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھ رہی تھیں لیکن ہندوستان کا تاجدار محمد شاہ رنگیلا مہ جبینوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا "ہنوز دلی دور است" کی ترنگ میں تھا۔

• بھارتی فوجیں ڈھاکہ پر یلغار کر چکی تھیں۔ جی ایچ کیو اور پاکستان کے صدر، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر جنرل یحییٰ کے دفتر میں ڈھاکہ سے پیغامات آتے تھے جو نذرِ جام کر دیئے جاتے تھے اور پاکستان کی سالمیت اور نظریہ پاکستان کا محافظ جنرل یحییٰ، نور جہاں، جنرل رانی اور بیگم جوناگڑھ کے ساتھ عیش کر رہا تھا۔

ماہ و سال گزرتے ہیں۔ تقریباً سات سال خاموش رہنے کے بعد جنرل یحییٰ، جنرل ضیاء کے حمایتی بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ اُس جنرل ضیاء کا جو بقول خود ان کے، پاکستان اور نظریہ پاکستان کے سب سے بڑے محافظ ہیں اور ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کو سب پر اولیت دیتے ہیں، ایسے راسخ العقیدہ مسلمان کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان کے رنگیلے جنرل یحییٰ فرماتے ہیں "چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق انتخابات منعقد کرانے اور اقتدار شہری نمائندہ انتظامیہ کو منتقل کرنے میں مخلص ہیں۔ مارشل لاء انتظامیہ عوام کے تعاون کی مستحق ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی ذمہ داری آسانی سے پوری کر سکے گی۔"

نصیب کی بات ہے کہ آج جنرل یحییٰ "پارسا" بن کر پاکستانی عوام کو مشورہ دینے کے قابل بنا دیئے گئے ہیں حالانکہ یہ وہی جنرل یحییٰ خان ہیں جن کو پاکستان کی سب سے بڑی عدالت، سپریم کورٹ آف پاکستان نے عاصمہ جیلانی کیس میں "غدار اور غاصب" قرار دیا تھا۔ غدار کی سزا ہر ملک میں پھانسی ہوتی ہے لیکن جنرل یحییٰ قسمت کے دھنی نکلے پہلے اپنی کوٹھی میں نظر بند رہے۔ اور اب قوم کے ناصح بن گئے ہیں لیکن جنرل (ریٹائرڈ) ٹکا خان خوش قسمت نہ ثابت ہوئے حالانکہ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں انہیں "ٹکا رک جاؤ" کا حکم دے کر بھارتی فوجوں کو پاکستان [illegible] سے باہر نکالنے سے روک دیا گیا تھا وہ آج مارشل لاء [illegible] کے تحت نظر بند ہیں ان کے خلاف زیر دفعہ ۳۰۷، ۴۵، ۴۴، ۱۴۷ اور ۱۴۹ ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ قائم ہو چکا ہے اور یہ مقدمہ فوجی عدالت میں چلایا جائے گا۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ قسمت کا کھیل نہیں، سیاست کا کھیل ہے کرسی کا کرشمہ ہے۔

سیاست کے کھیل والی بات دل کو لگتی بھی ہے فوجی حکومت کو اس وقت جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ عوام سے رابطہ نہ ہونے کا ہے عوام سے رابطہ کرنے کے لیے سیاسی امور کے مشیر مسٹر سومرو نے جو نسخہ کیمیا تلاش کیا ہے وہ "قومی حکومت" کا ہے ویسے یہ قومی حکومت کی تجویز بھی بڑی عجیب و غریب ہے علم سیاسیات کی رو سے قومی حکومت وہ ہوتی ہے جس کو پارلیمان کی مکمل حمایت حاصل ہو حزب اختلاف بھی حکومت کی تائید کرتی ہو اور یہ حکومت آئین کے تحت ہوتی ہے اور پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے عموماً قومی حکومت اسی وقت بنائی جاتی ہے جب ملک کو سنگین صورتحال کا سامنا ہو جنگ ہو رہی ہو یا معاشی بحران ہمہ گیر اور انتہا پر پہنچ چکا ہو۔ ایسے نازک حالات میں حزب اقتدار قومی حکومت کی تجویز پیش کرتی ہے حزب اختلاف حکومت میں شامل ہو جاتی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حزب اختلاف حکومت میں شامل نہیں ہوتی مگر غیر مشروط طور پر حزب اقتدار کی حمایت کرتی ہے اور تعاون کرتی ہے۔ برطانیہ میں جو "مادر جمہوریت" کہلاتا ہے صرف دو مرتبہ قومی حکومت بنائی گئی۔ ایک ۱۹۳۱ء کے عالمی اقتصادی کساد بازاری کے دوران اور دوسری جنگ عظیم دوم کے دوران لیکن ہمارے ملک میں علم سیاسیات میں ایک نئے باب اور نئی اصطلاح کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں "قومی حکومت" (اگر وہ بن گئی) نہ تو آئین کے تحت ہو گی نہ پارلیمان کے سامنے جوابدہ۔ بلکہ یہ مارشل لاء کے تابع ہو گی۔ اور چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر کے سامنے جوابدہ ہو گی۔

بہر حال چھوڑیئے اس قصہ کو آئین کی معطلی اور پارلیمان کی عدم موجودگی میں چند سیاسی جماعتوں پر مشتمل حکومت "قومی حکومت" کہلا سکتی ہے یا نہیں۔ فوجی حکومت، قومی حکومت بنانے کی زبردست کوشش ہی ہے کیونکہ ماہ رواں میں نیا بجٹ بھی منظور کرنا ہے اور نیا بجٹ بنانا اور منظور کرنا کوئی آسان کام نہیں، خصوصاً پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ نمائندہ حکومتیں تک ہل جاتی ہیں کیونکہ ٹیکسوں کے اضافے یا کمی دونوں پر عوامی ردعمل ہوتا ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ "قومی حکومت" بنانے میں عجلت اس لیے کی جا رہی ہے کہ نئے بجٹ کی ذمہ داری قومی حکومت میں شامل ہونے والی سیاسی جماعتوں پر عائد کر دی جائے۔

لیکن قومی حکومت کی تجویز عملی روپ اختیار کرتی نظر نہیں آتی۔ پیپلز پارٹی جو سندھ اور پنجاب میں بھاری اکثریت رکھتی ہے اس تجویز کی سخت مخالف ہے۔ قومی اتحاد میں شامل این ڈی پی اس کے حق میں نہیں اس کے قائدین خان عبدالولی خان، بیگم ولی خان اور شیر باز مزاری اس حماقت سے بچنے کے لیے بیرون ملک چلے گئے ہیں۔ بلوچ رہنما میر غوث بخش بزنجو نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ بلوچستان کے قائدین قومی حکومت میں شامل نہیں ہوں گے تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان بھی شمولیت سے انکاری ہیں دوسری جانب قومی اتحاد کی باقیماندہ جماعتیں بھی "لولی لنگڑی" قومی حکومت میں شامل

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

انتخابات کراؤ' چاہوگے تو پیپلز پارٹی دھمہ تک نہیں لے گی! لغاری

قومی حکومت کی تجویز اب قصہ پارینہ ہے مگر اس کے باوجود پاکستان قومی اتحاد کو اصرار ہے کہ قومی حکومت یا مخلوط حکومت میں شرکت کے لئے اس کی شرائط کو ضرور مدِ نظر رکھا جائے۔ پاکستان قومی اتحاد نے دو روزہ تک لاہور میں سر جوڑ کر قومی حکومت یا مخلوط حکومت میں اپنی شرکت کے بارے میں شرائط مرتب کیں۔ ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے تجاویز پر مشتمل ایک خط چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاالحق کے نام بھیجا گیا مگر بُرا ہو راولپنڈی کے موسم کا کہ طیارہ وقت پر نہیں پہنچ سکا اور خط خصوصی ایلچی کے پاس ہی رہ گیا جنہوں نے اسے اگلے روز چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تک پہنچایا۔ خط میں مندرج تجاویز اور شرائط سے جنرل صاحب کا ٹھنڈا مزاج ٹھنڈا نہیں رہا۔ اس تجویز نے تو بطور خاص جنرل صاحب کا پارہ کئی ڈگری بڑھا کر دیا کہ مارشل لاء مجوزہ قومی یا مخلوط حکومت کا ایک حصہ نہ ہو مجوزہ حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ انتخابات کے انعقاد کا اعلان کرے اور انتخابات کے بعد اقتدار منتخب افراد کے حوالے کر دے۔ اور اس حکومت میں کوئی فوجی شامل نہ ہو۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مارشل لاء انتظامیہ نے ان تمام شرائط اور تجاویز کو یکسر مسترد کر دیا ہے جو اس خط میں پیش کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں ان کا استدلال یہ ہے کہ قومی حکومت کی تجویز خود مارشل لاء انتظامیہ نے پیش کی تھی اور اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مجوزہ حکومت میں مارشل لاء کے نمائندے شامل نہ ہوں۔ عبوری حکومت کا استدلال یہ ہے کہ پاکستان قومی اتحاد نے یہ شرائط پیش کر کے حکومت کی توہین کی ہے۔ اگر حکومت نے قومی امور میں پاکستان قومی اتحاد کو بھی شامل کرنے کی تجویز کی تھی تو اس سے انہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو جانا چاہیئے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عبوری حکومت مارشل لاء کی ہے اور مسلح افواج اس امر کی ذمہ دار ہیں کہ وہ ملک میں نہ صرف یہ کہ امن عامہ بحال رکھیں بلکہ اپنے وعدے کے مطابق انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیں۔ مارشل لاء حکومت کی جانب سے قومی حکومت کی تجویز کو مارشل لاء کی کسی کمزوری پر محمول نہ کیا جائے بلکہ وسیع تر قومی مفاد کے لئے ہی یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔

پاکستان قومی اتحاد نے اپنے دو روزہ اجلاس کے پہلے روز پاکستان مسلم لیگ میں خان عبدالقیوم خان کی شرکت کے سوال پر بھی غور کیا۔ اس اجلاس کے آغاز میں ہی مولانا مفتی محمود نے مسلم لیگ کے نمائندوں سے کہا کہ خان عبدالقیوم خان کو اپنی جماعت سے نکال دو ورنہ۔۔ ورنہ کیا ہوگا۔ ملک قاسم نے گرج کر سوال کیا کہ مفتی صاحب آہستہ سے بولے ملک صاحب آپ تو ایسے ہی گرمی کھا گئے ورنہ ہماری مراد تھی کہ ٹھیک ہے ہم آپ کے معاملات میں کیسے ٹانگ پھنسا سکتے ہیں ان کا یہ جواب ایسے ہی تھا جیسے ایک ملازم نے اپنے باس سے کہا میری تنخواہ بڑھا دو ورنہ۔۔ باس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ورنہ کیا۔ نوکر نے جلدی سے جواب دیا ورنہ ہم اسی تنخواہ پر کام کریں گے۔ اگلے روز پہلے روز کے اجلاس کے بارے میں بریفنگ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ خان عبدالقیوم خان آئندہ انتخاب میں امیدوار بھی نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان کو مسلم لیگ میں کوئی عہدہ دیا جائے گا۔ اس بریفنگ پر پیر صاحب پگاڑا شریف نے کہا پاکستان قومی اتحاد کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے کسی رہنما کے بارے میں کوئی غیر آئینی پابندی لگائے۔ انہوں نے کہا اس موقف کا جواب صرف یہ ہے کہ حقارت سے مسکرا دیا جائے اور بس۔ انہوں نے کہا پاکستان قومی اتحاد کے رہنما اور مفتی محمود خود کو نجانے کیا سمجھتے ہیں دوسروں کو ڈکٹیشن

قومی حکومت میں شمولیت کیلئے اتحاد کی شرائط مسترد

ہم صرف قومی اتحاد کے متفقہ فیصلے کے پابند ہوں گے، پیر پگارا

دیتے ہیں اور اپنے رویہ پر غور نہیں کرتے۔ پاکستان قومی اتحاد کا دو روزہ اجلاس لاہور میں شروع تھا اور پیر صاحب پگاڑا شریف اسی شام لاہور سے راولپنڈی پہنچ رہے تھے انہوں نے اگلے روز مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس کی پاکستان قومی اتحاد کے ماے چودھری ظہور الٰہی کے گھر پہ صدارت کی شام کی نشست میں خان اعظم خان عبدالقیوم خان بھی شریک ہوئے گرماگرم بحث اور بات چیت کے بعد رات گئے اخبار نویسوں کو بتایا گیا کہ مسلم لیگ پاکستان قومی اتحاد کے متفقہ فیصلوں کی پابند ہوگی۔ پیر صاحب پگاڑا شریف اور خان عبدالقیوم خان سے ایک اخبار نویس نے پوچھا اس میں قومی حکومت یا مخلوط حکومت میں شرکت یا شرکت نہ کرنے کا فیصلہ بھی شامل ہے دونوں نے مسکرا کر کہا بالکل بھی کیوں نہیں۔

اخبار نویس کی حیرت دو چند تھی پھر پوچھا کہ مسلم لیگ تو مجوزہ حکومت میں شامل ہونا چاہتی ہے جواب ملا بالکل ٹھیک ہے۔ اخبار نویس نے پوچھا مگر پاکستان قومی اتحاد نے جو شرائط پیش کی ہیں ان کی موجودگی میں کیسے آپ علیحدہ سے شرکت کر سکیں گے دونوں رہنماؤں نے اخبار نویس سے کہا آپ بہت بھولے ہیں ہم نے اعلان کیا ہے کہ مسلم لیگ پاکستان قومی اتحاد کے متفقہ فیصلوں کی پابند ہوگی اگر ایک جماعت بھی کسی فیصلے سے متفق نہیں ہوتی تو اسے متفقہ فیصلہ نہیں کثرت رائے کا فیصلہ کہا جائے گا جس کی پابندی ہم پر لازم نہیں ہے۔ دونوں نے پوچھا اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اخبار نویس کی حیرت دور ہوگئی تھی اس نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔ خان عبدالقیوم خان نے کہا مگر یہ ساری بات آن دی ریکارڈ ہے۔ اخبار نویس پر اوس پڑ گئی۔ خان عبدالقیوم خان نے پیر صاحب پگاڑا شریف سے کہا اگر ان لوگوں کو اس طرح نہ روکا جائے تو سارا بھانڈا پھوڑ دیں۔ پیر صاحب نے مسکرا کر پائپ جلایا اور لمبا کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑ کر دور خلا میں گھورنے لگے۔ وہ یقیناً سوچ رہے ہوں گے مجوزہ حکومت میں گھوڑ دوڑ شروع ہو جائے گی، پیر صاحب کے ہزاروں روپے کی مالیت کے گھوڑے تھان پہ کھڑے کھڑے تباہ ہو رہے ہیں۔

سیاسی سرگرمیوں پر مکمل پابندی ہے اس کے باوجود پاکستان قومی اتحاد کا دو روزہ اجلاس لاہور میں اور مسلم لیگ کا طویل اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہوا اس آڑ سے تحریک استقلال نے بھی فائدہ اٹھایا اور پنجاب کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس راولپنڈی میں طلب کر لیا۔ ایئر مارشل ایم اصغر خان نے بھی شرکت کی۔ اجلاس نے سیاسی سرگرمیاں فوراً بحال کرنے، انتخابات کی حتمی تاریخ مقرر کرنے اور محاسبہ کا عمل تیز اور غیر جانبدار کرنے کے مطالبہ کو سختی سے دہرایا اور مجوزہ قومی یا مخلوط حکومت میں تحریک کی شرکت کے سوال کو یکسر مسترد کر دیا۔ اسی آڑ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن مسٹر فاروق احمد لغاری نے بھی راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اخبار نویسوں سے غیر رسمی بات چیت کی۔ اس بات چیت کی ہمیں تو اطلاع ہی نہیں ملی ورنہ ہم ضرور جاتے۔ اخبارات میں اس کی خبر شائع نہیں ہونے دی گئی۔ ویسے ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کے مطابق مسٹر فاروق احمد لغاری نے پیش کش کی ہے کہ اگر مارشل لاء انتظامیہ جلد از جلد انتخابات کرانے کا اعلان کرے تو پاکستان پیپلز پارٹی آئندہ انتخابات کے لئے قومی اور صوبائی اسمبلی کے لئے قطعی نئے امیدوار نامزد کرنے کو تیار ہے انہوں نے کہا اگر ہم سے اسی قدر خوف ہے تو ہم سب انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کئے دیتے ہیں انہوں نے کہا اس کے باوجود کہ مجھے مارشل لاء انتظامیہ نے ازراہ عنایت کلیئر کر دیا ہے۔ میں اسی کلیئرنس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اخبار نویسوں میں غیر ملکی اخبارات کے نمائندے بھی شامل تھے۔ پاکستانی اخبارات میں تو سرے سے یہ خبر نہیں چھپی البتہ بیرون ملک کے اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے اس بات چیت کی خبر اچھی طرح شائع کی۔ مسٹر فاروق لغاری کی باتیں عبوری حکومت کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ ان کو اگر شائع ہونے دیا جاتا تو عوام میں یہ تاثر ابھرتا اور بالکل صحیح ہوتا کہ اس معقول پیش کش کے باوجود مارشل لاء حکومت اگر انتخابات نہیں کراتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ انتخابات کرانے کے معاملے میں سنجیدہ ہے ہی نہیں۔

راولپنڈی کے اخبار نویس آج کل بڑے مزے کر رہے ہیں امریکی مرکز اطلاعات میں ان کے لئے ایک شاندار ایئر کنڈیشنڈ پریس روم بنا دیا گیا۔ رجعت پسند اخبارات اور ٹرسٹ کے اخبارات کے نمائندے سارا دن وہیں پڑے رہتے ہیں۔ کھانا بھی انہیں سستے داموں فراہم ہوتا ہے اور ٹھنڈے ماحول میں وہ موسم کی شدت سے بھی بچے رہتے ہیں۔ دنیا بھر کے سامراجی نکتہ نظر کے حامل اخبارات فراہم ہوتے ہیں۔ ٹرسٹ کے ایک اخبار نویس بھی اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو لئے یہاں براجمان رہتے ہیں۔ سامراج دوستوں اور رجعت پسندوں کا گٹھ جوڑ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نے حیات محمد خان کوثر نیازی کے ذاتی اخبار حیات کے بارے میں لکھا تھا کہ وہاں کوئی انقلاب آگیا ہے مگر اس میں بھی کوئی سازش کارفرما ہے ہماری بات درست ثابت ہو رہی ہے۔ حیات محمد خان نے اپنے دوست اور اخبار کے ایڈیٹر کو صرف پبلشر رہنے دیا ہے پالیسی ان کے اشارے پر ہی بدلی ہے کہ لوگ حیات محمد خان عرف کوثر نیازی کا اخبار پڑھنا تو درکنار اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان بدلے ہوتے حالات میں اخبار کی سرکولیشن بڑھی ہے اور سادہ لوح لوگ حیات محمد خان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے لگے تھے کہ ان پر ہم نے سازش آشکارا کر دی۔ حیات محمد خان تو ہمارے دشمن تھے ہی، اب اخبار کے پبلشر بھی ہمارے دشمنوں میں شامل ہوگئے ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

آزادیِ اظہار کی لاش پر

"جشنِ مجنوں"

عاشق کا جنازہ تھا ذرا دھوم سے اٹھا

وہاب صدیقی

مورخہ ۲۳ مئی بروز منگل!

لاہور میں ملک کے ممتاز صحافی اور شاعر فرہاد زیدی سمیت مزید چار صحافی گرفتار کر لئے گئے۔ اس طرح آزادیٔ صحافت کی تاریخی جدوجہد کے ۲۴ دیں دن گرفتار ہونے والے صحافیوں اور کارکنوں کی مجموعی تعداد ۴۴ تک پہنچ گئی۔

تربت میں لیوی اور پولیس نے طلبا پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ۲۵ طلبا شدید زخمی ہوئے، ۶۰ کو گرفتار کر لیا گیا جن میں اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی شامل ہیں۔ سرکاری ذرائع نے اس خبر کو چھپانے کی کوشش کی مگر لاکھ چھپانے کے باوجود چھپ نہ سکی تو خود سرکاری ترجمان کے ذریعہ حکومت کو یہ بتانے پر مجبور ہونا پڑا کہ پہلے بلوچستان کے شہر پنج گور میں طلبا پر فائرنگ ہوئی اس فائرنگ کے خلاف تربت کے طلبا نے احتجاج کیا تو ان پر بھی ۳۰ راؤنڈ چلا کر گولیوں کی بارش ماری گئی۔ زخمی طلبا میں سے پانچ کی حالت نازک ہے۔

کراچی میں سرسید گرلز کالج کے پھاٹک پر بھوک ہڑتال کرنے والی این۔ ڈی۔ وی۔ پی کی خاتون اساتذہ کی حمایت میں طالبات نے نعرے لگائے تو پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا۔ انہیں گھیرے میں لے کر بلیغار کر دی اور ۱۳ طالبات کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی مانند اٹھا کر پولیس کی گاڑیوں میں ڈالا گیا اور نظر بند کر دیا گیا دو بھوک ہڑتالی خواتین کو بھی پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اس طرح اب تک ۲۰ ہڑتالی خواتین لیکچرار کی گرفتاری عمل میں آچکی ہے مگر اپنے جائز حقوق کے لئے ان کی جدوجہد جاری ہے زیرِ حراست خاتون اساتذہ نے اسپتال میں بھی بھوک ہڑتال توڑنے سے انکار کر دیا۔ چار کی حالت نازک بتائی جاتی ہے

یہ اخبارات میں شائع ہونے والی ایک ہی روز کی خبریں ہیں۔

مگر اسی کراچی میں ۲۳ مئی کو اور منگل ہی کے روز ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے چمکتے دمکتے ہال میں دھوم دھام سے "جشنِ مجنوں" کے عنوان سے مجنوں گورکھپوری کی پلاٹینم جوبلی منائی گئی۔ عجب تماشا تھا۔ ادھر کراچی پریس کلب میں آزادیٔ اظہار کی جنگ لڑنے والے مجاہد صحافی قید بامشقت جھیلنے کے لئے رختِ سفر باندھتے تھے۔ کراچی یونیورسٹی کی آرٹس لابی میں طلبا احتجاجی جلسہ کرتے تھے اور پنج گور اور تربت کے طلبا پر فائرنگ کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے۔ کراچی کے عباسی شہید اسپتال میں بھوک ہڑتالی خاتون لیکچرار موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھیں اور پولیس کے لاٹھی چارج سے متاثر ہونے والی اور زیرِ حراست طالبات کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ دوسری طرف انٹرکانٹی نینٹل کے ٹھنڈے ٹھنڈے ایئرکنڈیشنڈ ہال میں "جشنِ مجنوں" کا دھوم دھڑکا ہوتا تھا۔

"جشنِ مجنوں" ایک بار ملتوی بھی ہوا۔ اور ماہر القادری مرحوم کے سوگ میں ملتوی ہوا۔ آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ اظہار کی جنگ لڑنے والے صحافیوں کی حمایت میں بھی یہ جشن ملتوی ہو سکتا تھا۔ مگر "جشنِ مجنوں" ہوا۔ اور نہایت دھڑلّے سے ہوا۔ کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ آزادیٔ اظہار کی حمایت اور صحافیوں پر ظلم و ستم کے خلاف ایک عدد قرار داد ہی پیش کرنے کی جراٗت کرتا۔ علم و دانش اور لوح و قلم کی کچھ تو آبرو رہ جاتی۔ کچھ ہوا تو یہ ہوا کہ گرمیٔ گفتار کے شہسواروں نے تقریرِ دل پذیر کے جوہر دکھائے۔ سرد اور مہکتے مشروبات سے خشک گلے تر کئے گئے۔ عالم یہ تھا کہ مردہ بدست زندہ مجنوں گورکھپوری ہار پھول ڈالے دولہا بنے بیٹھے تھے اور لرزتے کپکپاتے ہاتھوں سے پندرہ ہزار کی نقد تھیلی وصول کرتے تھے۔ ڈاکٹر احسان رشید انہیں لخلخہ سنگھانے کے لئے گل پاشی کرتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری اپنی عزت افزائی پر پھولے نہ سماتے تھے، ہنستے تھے، مسکراتے تھے اور قہقہوں اور تالیوں کے درمیان اپنے پوپلے منہ سے ادبی غبارے چھوڑتے تھے، عمرِ رفتہ کو آواز دیتے تھے۔

سنا ہے "جشنِ مجنوں" میں ادیب تھے، شاعر تھے اور دانشور بھی تھے۔ اور ادیبوں اور شاعروں ہی کے بارے میں یہ بھی سنا ہے کہ وہ معاشرے کا شعور اور اس کا ضمیر ہوتے ہیں۔ حساس ہوتے ہیں، گداز دل رکھتے ہیں۔ ہر ظلم و ستم پر تڑپ جاتے ہیں ہر بے انصافی پر ان کا ذہن تلوار کی کاٹ

اور شعلے کی تپش بن جاتا ہے، اور جب آزادیٔ اظہار کا مرحلہ آجاتے تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر پرورش لوح و قلم کرتے ہیں۔ زنداں آباد کرتے ہیں اور دار و رسن کی آزمائش سے گزرتے ہیں۔ ایسے ادیب انقلابی اور ترقی پسند کہلاتے ہیں۔

مگر ہر دور اور عہد کے اپنے ترقی پسند اہل قلم ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین ایک ملک گیر تنظیم تھی۔ احمد ندیم قاسمی اس کے سکریٹری جنرل تھے۔ جب انجمن زیرِ عتاب آئی تو احمد ندیم قاسمی نے انجمن کا بستر بوریا گول کیا اور گوشۂ عافیت آباد کیا اب تک وہ اسی گوشۂ عافیت کے خول میں بند ہیں۔ مجلس ترقی ادب کے سکریٹری ہیں۔ اپنا رسالہ "فنون" شائع کرتے ہیں۔ کالم نویسی بھی کرتے ہیں۔

افسانے بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں اور اس شان سے کہتے ہیں کہ رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں۔ غرضیکہ وہ موج کرتے ہیں بلکہ موج در موج کرتے ہیں اور جب کوئی ادیب، شاعر موج در موج کے بھنور میں پھنس جاتا ہے تو وہ گھونگے کی مانند اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ نہ اُسے آزادیٔ صحافت کی جد و جہد نظر آتی ہے نہ دستور زباں بندی نظر آتا ہے۔ نہ کوڑوں کی سزائیں، نہ طلبا پر فائرنگ نظر آتی ہے اور نہ ہی بھوک ہڑتالی خاتون اساتذہ کی جاں کنی نظر آتی ہے وہ کراچی اور لاہور کی میونسپلٹیوں کا داروغۂ صفائی بن جاتا ہے۔ اسے معاشرے میں ظلم و استحصال کے بجائے مچھروں اور مکھیوں کی افزائش نسل، گندے نالوں کا بہاؤ، سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ، تانگے والوں کے مریل گھوڑے اور رکشاؤں کے صبا رفتار میٹر نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں جب کوئی ادیب و شاعر تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی یا لاہور کی ماڈل کالونی میں اپنا نشیمن بنا لیتا ہے۔ یا اس "کوہ ندا" کی جانب سرپٹ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسٹیٹس کریز میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا موذی مرض ہے۔ جو اس مرض میں مبتلا ہوا، اسیرِ دامِ ہوس ہوا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کمانے کی دھن میں مگن ہو کر آنکھیں اور کان بند کر لیتا ہے اور اگر اس کا پیشہ ادب بلکہ "ترقی پسند ادب" فروخت کرتا ہو تو وہ دریوزہ گر بن جاتا ہے اور تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہے اور تین سو ماہانہ پرچہ چھاپ کر تین ہزار ماہانہ کے اشتہارات، ادب کی زبوں حالی کی دہائی دے کر، حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ایسا ادیب اگر کسی طور شہرت کما لیتا ہے تو وہ ادبی ثقافتی تقریبات میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ کبھی مہمانِ خصوصی بنتا ہے۔ کبھی صدرِ جلسہ بنتا ہے اور ایک عدد لکھی لکھائی یا منہ زبانی رٹی رٹائی تقریر کے ذریعے دانشوری کے جوہر دکھاتا ہے۔ وہاں حالیکہ دانشوری کے جملہ حقوق، حکیم محمد سعید عرف حکیم ہکلے، ڈاکٹر احسان رشید، رئیس امروہوی، تقی امروہوی اور ہاشم رضا نے اپنے حق میں محفوظ کرالئے ہیں۔

ان کی دانشوری کی انفرادیت ان کے گٹ اپ سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً حکیم ہکلے کا ٹریڈ مارک سفید شیروانی، سفید پاجامہ اور سفید جوتا ہے۔ وہ برق اور سرف کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں۔ ڈاکٹر احسان رشید کی دانشوری ان کے پائپ کے دھوئیں سے قائم ہے۔ رئیس اور تقی پان چباتے ہیں اور اپنی دانشوری کا مظاہرہ آداب و کورنش کی لوچ و لچک سے کرتے ہیں۔ ہاشم رضا کی دانشوری کا بھرم اس بات پر قائم ہے کہ وہ نوآبادیاتی نوکرشاہی کے نہایت مستند کارندے رہ چکے ہیں۔ ان "دانشورانِ ذی شان" کے لئے ہر دورِ حکومت ان کا دورِ حکومت رہا ہے۔ حکومت کسی خان کی ہو، کسی پارٹی کی ہو، یہ ایوانِ حکومت میں کسی نہ کسی چور دروازے سے داخل ہو جانے کا گُر جانتے ہیں۔

جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور بھٹو وزیرِ اعظم تھے تو یہ پانچوں دانشور بشمول کورس کی دھن میں قصیدہ گوئی فرماتے تھے اور سیاست کے مرغ باد نما کا رخ بدلتے ہی ایسے بدل گئے اور اس تیزی سے بدلے جیسے موٹر کار کا اسٹیرنگ وہیل ہر موڑ پر دائیں بائیں گھومتا ہے۔ مگر اس قصیدہ گوئی اور ثنا خوانی کے چکر میں ڈاکٹر احسان رشید وائس چانسلر بن گئے۔ باپ ان کے رشید احمد صدیقی تھے۔ زندگی بھر قلم گھستے رہے مگر شعبہ اردو کی صدارت سے آگے نہ بڑھے۔ وائس چانسلری کی حسرت دل میں لئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مگر احسان رشید جو علی گڑھ یونیورسٹی میں جونیئر لیکچرار تھے، پائپ کا دھواں اڑاتے کراچی پہنچے تو کھٹاک سے شعبہ معاشیات کے صدر بن گئے۔ کمال اظفر کی یاری نے کمال دکھایا۔ باپ کو پسِ پشت ڈالا اور سرسید سے ازدواجی رشتہ نکال کر ان کی خاندانی وجاہت کا ڈھونگ رچایا۔ نوعیت اس کی کچھ یوں ہے کہ احسان رشید سرسید کے پوتے سر راس مسعود کی مطلقہ بیوی کے ایک عدد داماد بھی ہیں۔ یہ رشتہ تلاش کر کے کمال اظفر نے سابق وزیر اعلیٰ سندھ غلام مصطفیٰ جتوئی کو شیشے میں اتارا۔ کمال اظفر کو اگر "فرزندِ کراچی" کہلانے کا ارمان تھا تو جتوئی کو عروس البلاد کراچی کا نوشاہ بننے کا شوق تھا۔ اس شوق کے ہاتھوں وہ مہاجر قصیدہ گو چیرٹ قناطیوں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس مہاجر گردی اور جتوئی کی کوٹھی کے طواف کے بل بوتے پر احسان رشید وائس چانسلری لے اڑے۔ حکیم ہکلے نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی کی انتخابی دھوم دھام سے مرعوب ہو کر محمود اعظم فاروقی کو دو لاکھ روپے دے کر انتخاب لڑایا تھا مگر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہوں نے کوثر نیازی کی مصاحب گیری اور جوڑ توڑ کے ذریعہ پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کر کے محمود اعظم فاروقی ہی کے خلاف انتخاب لڑا۔ الیکشن تو وہ ہار گئے بلکہ جماعت اسلامی کی دہشت پسند تنظیم انصار المسلمین کے مشٹنڈوں کے ہاتھوں ان کی اچھی خاصی مرمت بھی ہوئی۔ مگر اس "کاروبارِ انتخاب" میں وہ دو کروڑ روپے کا واجب الادا انکم ٹیکس ادا کرنے سے صاف بچ گئے۔ لطف یہ کہ اب بھی انکم ٹیکس ادا کرنے سے بچے ہوتے ہیں۔ پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا لیکن حکیم ہکلے کا ہمدرد ٹرسٹ بچ گیا۔ یہی حکیم ہکلے کا کمال فن ہے۔۔۔

یہ حکیم سعید وہی ہیں جن کے والد بزرگوار گلی قاسم جان کے تھڑے پر ہاون دستہ چلاتے تھے اور اتنی مدت تک چلاتے رہے کہ ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے۔ جب بڑے بیٹے نے ایک قصائی کی دکان میں عطاری کی دکان کھولی تو انہیں سعید ہکلے کو حکیم بنانے کی سوجھی۔ ادھر صاحبزادے نے میٹرک پاس کر لیا۔ باپ عطار، ماموں چھیپی والے خاندان میں میٹرک پاس صرف یہی تھے۔ سو انہیں ڈاکٹر بننے کا شوق چرایا مگر سعید ڈاکٹر نہ بن سکے اور حکمت کی سند سے بھی محروم رہے۔ باپ عاجز آگئے تو ایک روز بڑے بیٹے سے کہا "یہ ہکلا کچھ کرنے کرانے کا نہیں، اسے یہاں سے دفع کرو" سو یہ پاکستان وارد ہوئے اور متروکہ جائیداد کے ساتھ حکمت بھی الاٹ کرا لی جس طرح سوداگرانِ دہلی کے کچھ سوت فروش اور جفت ساز کراچی پہنچ کر نواب بن گئے اسی طرح حکیم ہکلے بھی دانشور بن گئے۔

ان ہی حکیم ہکلے نے "جشنِ مجنوں" کے لئے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کا بندوبست کیا۔ اور دانشوری کی خیرات نکال کر دل شاد کیا۔ یہ مجنوں گورکھپوری کون ہیں پرانی ادیبوں کی کھیپ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے ماضی کا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں جن دنوں اردو میں انگریزی تنقید

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

کیا شاہ خالد نے گرین سگنل دے دیا ہے؟

دیوان بریندر ناتھ "پیٹریوٹ" نیو دہلی ۲۵- اپریل ۱۹۷۸ء

جنرل ضیاء کا دورہ سعودی عرب بلاشبہ ایک "زیارت" تھا، روحانی بھی اور سیاسی بھی۔

ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بڑے مشکور ہوئے ہونگے کہ انہیں اس قدر جلد مقامات مقدسہ کی دوبارہ زیارت کا موقع ملا۔ گزشتہ دورہ انہوں نے چھ ماہ قبل کیا تھا۔ تنازعہ ان کے مکہ میں عمرے اور مدینہ کی زیارت پر نہیں بلکہ متنازعہ وہ مذاکرات بن گئے ہیں، جو اطلاعات کے مطابق انہوں نے اپنے سعودی میزبانوں سے کئے۔ مذاکرات جن کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے مشترکہ دلچسپی کے وسیع پہلوؤں پر محیط تھے۔ یقیناً فوری دلچسپی کا ایک معاملہ، مسٹر بھٹو کے بارے میں ضیاء حکومت کا رویہ بھی تھا۔

سعودی عرب واحد اہم ملک ہے جس نے اعلانیہ اس موضوع پر کچھ نہیں کہا ہے۔ لیکن بھٹو کے حامی پاکستانی پریس کا دعویٰ تھا کہ شاہ خالد نے بھی جنرل ضیاء کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ (ضیاء) مسٹر بھٹو کو پھانسی نہ دیں کیونکہ اس کے نتائج "خوفناک" ہوں گے۔ مگر جنرل ضیاء الحق کی پالیسیوں کے بارے میں سعودی عرب کی حد سے زیادہ فراخ دلانہ تعریف اس کی تردید کرتی ہے۔ شاید یہ بھٹو کے حامی عناصر کی خوش فہمی تھی، جس کے سبب انہوں نے دعویٰ کیا کہ شاہ خالد کو مسٹر بھٹو کی جان بچانے سے دلچسپی تھی۔

گرین سگنل؟

اس معاملے میں سعودی عرب کے رویہ کی حقیقی بنیاد ممکنہ عملی نتائج پر ہوگی۔ لندن سے شائع ہونے والے پاکستانی ہفتہ وار "وطن" کے مطابق سعودی عرب کے حکمران نے جنرل ضیاء الحق کو "گرین سگنل" دے دیا ہے کہ وہ پھانسی دے دیں بشرطیکہ ان کی حکومت اس کے نتائج کا مقابلہ کرسکتی ہو۔

اس نظریہ کے پیش نظر مسٹر بھٹو کو معافی دینے کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوگا جب پاکستان میں صورت حال خراب ہوگی

سعودی عرب کی خاموش منظوری سے (بھٹو کے معاملے میں جنرل ضیاء الحق جو کارروائی مناسب سمجھیں کریں) زیادہ اہم ریاض کا وہ وعدہ ہے کہ جدہ میں واقع اسلامی سکرٹریٹ اور مدینہ میں واقع رابطہ اسلامی مسٹر بھٹو کے لئے حکومت پاکستان سے باضابطہ رحم کی اپیل نہیں کریں گے۔

اسلامی زاویہ نگاہ

ابتدائی رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ مسلم ممالک کی ایک بڑی تعداد خصوصاً لیبیا، متحدہ عرب اماراتوں اور کویت نے اسلامی سکریٹریٹ سے رابطہ قائم کیا تھا کہ وہ دنیا کی مسلم برادری کی جانب سے مسٹر بھٹو کی زندگی کے لئے اپیل کریں۔

سعودی عرب حقیقی معنوں میں مذکورہ بالا دونوں تنظیموں کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس لئے ریاض کا رویہ بلاشبہ اثر ڈالے گا۔ بھٹو کے مسئلے پر اسلامی سکریٹریٹ جیسی تنظیموں کی غیر جانبداری بلاشبہ جنرل ضیاء الحق کی سیاسی مدد کے مترادف ہوگی اور یہ غیر جانبداری موثر طور پر بھٹو کے حامی عناصر کی اس اہم دلیل کی نفی کردے گی کہ مسٹر بھٹو کی جان بچ جائے گی کیونکہ وہ اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئرمین ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے دورہ سعودی عرب کا ایک ذیلی نتیجہ پاکستان کی مالی امداد جاری رکھنے کا وعدہ ہے بعض مسلم ممالک مثلاً لیبیا اور متحدہ عرب امارات یہ واضح کرچکے ہیں اگر مسٹر بھٹو کو دار پر لٹکایا گیا تو وہ پاکستان سے کئے گئے مالیاتی وعدوں کو مکمل طور پر کالعدم کردیں گے۔ ایسی صورت میں سعودی عرب کا یہ وعدہ کہ وہ معاشی امداد بدستور دیتا رہے گا جنرل ضیاء کی حمایت کا ایک بڑا طریقہ بنے گا۔ کیونکہ اگر دیگر مسلم اقوام مالیاتی امداد بند کردیتی ہیں تب بھی تنہا سعودی عرب ایک یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک پاکستان کی معیشت کو ہنگامی بنیادوں پر برقرار رکھ سکتا ہے۔

سعودی رقم اور اخلاقی حمایت کے عوض جنرل ضیاء الحق نے شاہ خالد سے کیا وعدہ کیا؟ معلوم ہوا ہے کہ جنرل ضیاء نے سعودی عرب کو مسلم دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے سعودی عرب ایک جانب مسٹر بھٹو اور کرنل قذافی جیسے رہنماؤں اور دوسری جانب بادشاہوں مثلاً شاہ ایران کے بارے میں "انتہائی بدگمان" ہیں۔ درحقیقت شاہ ایران اور لیبیا کے کرنل قذافی دونوں نے باوجود اپنی مضبوط باہمی تنفر کے بھٹو نواز جذبات کا اظہار کیا ہو سکتا ہے یہی اظہار ریاض کے جنرل ضیاء الحق کے حق میں جانے کا سبب بنا ہو۔ اطلاعات کے مطابق مسٹر بھٹو کے برعکس جن پر الزام ہے کہ وہ اسلامی دنیا کے "بوناپارٹ" بننا چاہتے تھے جنرل ضیاء الحق نے سعودی حکمرانوں کو یقین دلایا کہ وہ منکسر المزاج کردار ادا کرنے میں بہت زیادہ اطمینان محسوس کریں گے۔

ایران کے لئے پریشانی

پاکستان میں ایسی تابعدار قیادت، سعودی عرب کو اپنی پوزیشن خصوصاً خلیج کے علاقے اور عموماً اسلامی دنیا میں مضبوط بنانے میں معاون ہوگی۔ پاکستان ایک نہایت اہم غیر عرب ملک ہے۔ جو اسلامی دنیا کے جغرافیہ میں اہم فوجی مقام پر واقع ہے۔ اور اس میں مغربی ایشیا اور جنوبی ایشیا کی پاور پالیٹکس پر دباؤ ڈالنے کی صلاحیت ہے۔

خلیج کے علاقے کا "بڑا محافظ" بننے کے لئے ایران جو کردار ادا کر رہا ہے۔ سعودی عرب اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس طرح شاہ خالد اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان قریبی ذاتی ہم آہنگی ایسے اثرات کی حامل ہوسکتی ہے جو ان فوری مسائل سے آگے جاتے گی جن کا پاکستانی حکمرانوں کو ان کی داخلی سیاست میں سامنا ہے۔

قومی حکومت

ریاض اور اسلام آباد کا قریبی تعاون، پاکستان کے

اندرونی صورت حال پر بھی اثر انداز ہوگا۔ اور جنرل ضیاءالحق کو ملک کے دائیں بازو کے عناصر کی حمایت اور ان پر سیاسی کنٹرول حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے بارے میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ سعودی عرب سے ہدایات حاصل کرتی ہیں۔ اگر سعودی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جنرل ضیاءالحق کی مکمل حمایت کی جائے تو یہ جماعتیں ایسا ہی کریں گی اور یہاں تک کہ ان (جنرل ضیاء) کی حکومت میں شامل ہو جائیں گی۔

یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جنرل ضیاءالحق کے دورۂ سعودی عرب کے فوراً بعد..... کشمیر کے معزول سربراہ سردار عبدالقیوم نے ضیاء حکومت کی مدد کی غرض سے "قومی حکومت" کے لئے از سرنو کوششیں شروع کر دیں۔

تاثر ملتا ہے کہ سردار قیوم، مولانا کوثر نیازی کے ہمراہ مارشل لاء حکومت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اور ان کی کوشش ہے کہ جنرل ضیاءالحق کی تجویز پر قومی حکومت کی تشکیل کے لئے حمایت حاصل کریں۔ اگرچہ سرکردہ سیاسی شخصیتوں مثلاً عبدالولی خان اور ائیر مارشل اصغر خان، قومی حکومت کی تجویز کو مسترد کر چکے ہیں لیکن اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ بعض رجعت پسند سیاستدان انتہائی دائیں بازو کے لیڈر "عبوری حکومت" میں وزراء بننے کی پیشکش کو قبول کر لیں اور اس طرح جنرل ضیاءالحق کو ایک سیاسی بنیاد میں مدد دیں۔

مسئلہ سب سے زیادہ طاقتور سیاسی دشمن سے نمٹنے کا ہے

نیوز ویک
۲۹ مئی ۱۹۷۸ء

اس وقت جبکہ جیل کی بلند سنگین دیواروں سے ماہر نشانہ بازوں کی ایک ٹیم نگرانی کر رہی تھی۔ پاکستان آرمی کا ایک ہیلی کاپٹر ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کے صحن میں اترنے کے لیے چکر لگا رہا تھا۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا مانوس جسم سے اس سے باہر آیا۔ پانچ پہریدار انہیں اس بغیر کھڑکی کے تنگ کمرے تک پہنچانے کے لیے آگے بڑھے جس میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آخری دن گذاریں۔ جب انہیں تالے میں بند کر دیا گیا تو بھٹو نے اپنے وکیل سے کہا "اگر حکام مجھے اس طرح مارنا چاہتے ہیں تو یہ قطعی طور پر ان کی صوابدید ہے"۔

بھٹو کے پرامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پاکستان سپریم کورٹ نے سابق وزیراعظم کی اس اپیل پر غور کرنا شروع کر دیا جو انہوں نے اس سزائے موت کی تبدیلی کے لیے کی ہے۔ جو دو ماہ قبل انہیں لاہور میں سنائی گئی تھی۔ بھٹو کے وکلاء نے قانونی دلائل کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا ہے۔ دنیا بھر سے رحم کی اپیلوں کی بارش ہوئی ہے لیکن جنرل ضیاءالحق کی فوجی حکومت، جس نے پچھلی جولائی میں بغیر خون خرابے کی بغاوت میں ان کا تختہ الٹا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس فیصلے پر پہنچ رہی ہے کہ اپنے سب سے زیادہ طاقتور سیاسی دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔

جنرل ضیاء کے نکتہ نظر سے یہ راستہ کافی پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ بغاوت کے فوری بعد جنرل نے اعلان کیا تھا کہ ۹۰ دن کے اندر انتخابات منعقد ہوں گے اور انہوں نے پاکستان کو سیاسی عبدیت سے معمول پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خود بھٹو کو جلد ہی جیل پہنچا دیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ ایک زبردست سیاسی مخالف کی حیثیت سے باقی رہے۔ ان کی پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) برقرار رہی۔ ان کے حامیوں نے ملک بھر میں حکومت کے خلاف جذبات کو ہوا دی۔ بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سے ضیاء انتخابات منسوخ کرنے پر مجبور ہوتے۔ جنرل نے اس بات کو ضروری پایا کہ بھٹو کے ہزاروں حامیوں کو جیلوں میں ڈال دیں اور "قومی مفاہمتی حکومت کے قیام کے منصوبے" کو ترک کر دیں۔ ملک کے ممتاز سیاستدانوں میں سے کوئی

بھی اس حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں تھا جس کو بھٹو کو پھانسی دینے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہو۔

ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی رہنماؤں کی طرف سے سزائے موت پر اظہار افسوس کے پیغامات پر جنرل مشتعل ہوتے ہیں۔ امریکہ، مغربی جرمنی اور چین کی حکومتوں نے تار کے ذریعہ اعتراض کیے۔ سوویت رہنما لیونائڈ برزنیف اور برطانوی وزیراعظم جیمس کالیہان نے ذاتی اپیلیں بھیجیں۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی نے سابق وزیراعظم کو جلاوطنی کے لیے لے جانے کے لیے ایک ہوائی جہاز پاکستان بھیجنے کی پیشکش کی۔ ادھر ایرانی حکومت نے پچھلے مہینے یہ تک ظاہر کر دیا کہ اگر پھانسی دے دی گئی تو پاکستان ایران کی ۳۰ کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد سے محروم ہو جائے گا۔

ضیاء اور ان کے رفیق جنرل بین الاقوامی ردعمل کی وسعت سے واضح طور پر حیران ہوئے تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ بالآخر اس دباؤ کے سامنے جھک جائیں۔ لیکن فی الحال وہ ملک کے اندر بھٹو کی مؤثر طور پر خلل انداز ہونے والی سیاسی قوت کے بارے میں زیادہ فکر مند ہیں۔ راولپنڈی میں اعلیٰ سطح کے ایک فوجی ذریعے نے کہا کہ "ضیاء کے سامنے برائیوں میں انتخاب کا مسئلہ ہے۔ خالص غیر جذباتی طریقہ کار کی اصطلاح میں بھٹو کی موت ان میں سے چھوٹی برائی ہے"۔

بھٹو کو جنہیں اپنے ایک وقت سیاسی حلیف کے والد کے قتل کی سازش کرنے پر سزا دی گئی ہے۔ اب بھی ایک دن عدالت میں پیش ہونے کا موقع ملے گا۔ ان کے وکلاء کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے نئے اہم ثبوت حاصل کر لیے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ بھٹو کو سیاسی بنیاد پر سزا دی گئی ہے۔ انہوں نے ضخیم مواد حاصل کیا ہے جس میں پاکستان انٹیلی جنس بیورو کے سابق ڈائرکٹر کا حلف نامہ بھی شامل ہے جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ لاہور مقدمے میں استعمال کی جانے والی اکثر شہادتوں میں ضیاء کے آدمیوں کے حکم پر جعلسازی کی گئی ہے۔

اپیل کی کارروائی مہینوں تک جاری رہ سکتی ہے لیکن کئی مقامی ماہرین قانون کی رائے میں فیصلے میں تبدیلی کا امکان نہیں ہے کیونکہ اس سے ملک کے پورے عدالتی نظام کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔ سیاسی سطح پر بھی ان کا مقدمہ کمزور پڑ گیا ہے کیونکہ بھٹو کے حامی گلیوں میں قائل کر دینے والا طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے

کہ اب عیناردان کے رفقار کو اعتماد ہے کہ وہ بھٹو کو پھانسی دینے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کسی گڑبڑ پر قابو پاسکتے ہیں۔ راولپنڈی میں ایک مغربی سفارت کا کہنا ہے کہ" لاہور فیصلے کے اعلان سے پہلے وہ بہت گھبراتے ہوتے تھے لیکن جب اعلان ہوگیا اور گڑبڑ محدود رہی تو وہ مطمئن ہوگئے۔"

پچھلے ماہ پڑوسی ملک افغانستان میں بائیں بازو کی بغاوت بھی بھٹو کے لیے اسی طرح منحوس رہی۔ بغاوت کے بعد سے پاکستان کے فوجی حکمران احتیاط کے ساتھ اپنی شمالی سرحدوں پہ نظر رکھتے ہوتے ہیں۔ اور پاکستانی بائیں بازو والوں کے خلاف حرکت میں آگئے ہیں جن کی کثرت بھٹو کی پرجوش حامی ہے۔ اس وقت تک سینکڑوں افراد کو احتجاج کرنے پر جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں حکومت کا دعویٰ ہے کہ" سودیت شہہ پر چلائی جانے والی اسی تحریک کا حصہ ہے جو افغان بغاوت پر منتج ہوئی"۔ بیرونی خطرے کے بارے میں فکرمند فوجی حکام اس شخص کو ختم کرنے کے لیے اور سختی سے کوشش کریں گے جو ان کی نظر میں داخلی طور پر تقسیم کرنے والی قوت ہے۔"

بم کسی وقت بھی پھٹ سکتا ھے

المستقبل پیریس

پیرس کے عربی جریدے المستقبل نے اپنی حالیہ اشاعت میں پاکستان میں جناب بھٹو کے دور کو ایک ماہرانہ اور قابل قدر قرار دیتے ہوتے لکھا ہے کہ جناب بھٹو نے جس وقت زمام حکومت سنبھالی اس وقت ان کی حیثیت ایک ممتاز سیاست داں ہی کی نہیں تھی بلکہ ایک ایسے نجات دہندہ کی تھی جو باقی ماندہ انتشار کے شکار پاکستان کو بچا سکتی تھی اور اس کی حفاظت کر سکتی تھی۔ جریدے نے اپنے مستقل کالم" الموقف الاولی" میں کیا مسٹر بھٹو کے سر کی کوئی قیمت نہیں" کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جناب بھٹو نے ایسے حالات میں اقتدار سنبھالا جب کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی تباہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے داخلی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کامیاب حکمت عملی اختیار کی اور پاکستان کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ لیکن آج حالات ذرا مختلف ہیں، جنرل ضیا الحق نے انہیں اقتدار سے محروم کر دیا ہے لیکن ان کے ہٹنے کے ساتھ ہی عالمی برادری میں پاکستان کے وقار میں کافی کمی ہوگئی ہے جریدے نے لکھا ہے کہ آج پاکستان کے بعض لوگوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ جناب بھٹو وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس دور میں ان کی قیادت کی جو تاریخ کا نازک ترین دور تھا ان لوگوں نے یہ حقیقت بھی فراموش کر دی ہے کہ جناب بھٹو وہ رہنما ہیں جنہوں نے پاکستان کو بچایا اور اس کی حفاظت کی اور وہ ہی اس قوم کے نجات دہندہ ہیں۔ جریدے نے لکھا ہے کہ ..... نے پہلے جناب بھٹو کو جیل پہنچایا اور اب انہیں قاتل قرار دے دیا گیا ہے۔ جریدے نے لکھا ہے کہ چند ماہ پہلے کی خبروں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جنرل ضیا دنیا اور اپنے ہم وطنوں کے سامنے یہ وعدے کرتے تھے کہ ان کی حکومت تین ماہ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے بعد بیرکوں میں لوٹ جانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت جنرل ضیا اپنی بات میں سچے ہوں لیکن کسی شخص کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ باور کرنا انتہائی مشکل امر ہے کہ وہ تین ماہ بعد حکومت چھوڑ دے گا۔ یا وہ حکومت طشت میں سجا کر کسی دوسرے کے سپرد کر دیگا۔

جریدے نے لکھا ہے کہ اگرچہ جناب بھٹو کے خلاف مظاہروں میں کچھ جانیں ضائع ہوئیں، ..... نے جناب بھٹو پر صرف ایک سیاسی قتل پر مقدمہ چلانا پسند کیا۔ اور ابتدا ہی سے مقدمہ کو ایک اعلیٰ مثال بنا کر پیش کیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا گویا یہ مقدمہ حکمرانوں کے لئے درس عبرت اور نصیحت ہے اور قاتل کو قتل کی سزا دی جا رہی ہے، جریدے نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں افسوسناک امر یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ بلاشبہ جناب بھٹو کا مسئلہ صرف ان کا یا جنرل ضیا کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں کا مسئلہ ہے جو کل بھٹو کے سر کے لئے تالیاں بجا رہے تھے اور آج فیصلے کے بعد ان کے سر کا تقاضہ ایسے حالات میں ... کہ پاکستان کو وسیع جمہوری بنیادوں کی ضرورت ہے جنرل ضیا اس بات کا اقرار کریں یا نہ کریں یہ ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو سزائے موت سنائی گئی ہے یہ وہ ہی شخص ہے جس نے پاکستان کی حفاظت کی ہے کرتے ہوتے تالیاں بجا رہے ہیں۔ بلکہ یہ پوری تیسری دنیا کا مسئلہ ہے اور یہ اس پوری دنیا کا مسئلہ ہے جس نے اپنی تاریخ پر اعتبار نہیں کیا اور نہ قرون وسطے کی پوری تاریخ سے سبق حاصل کیا۔ دوسرے آج کے دور میں بھی ہر وہ شخص اپنی اسالیب کا سہارا لیتا ہے لیکن لوگوں کے سر ہمیشہ مسائل کا حل ثابت نہیں ہوتے کبھی کبھی ان کا حجم بڑا ثابت ہوتا ہے اس کے برعکس یہ ایک وقتی حل ہوتا ہے جنرل ضیا جس قانون سے مسلح ہیں اس کی مثال ایک بم کی سی ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ بم بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اس سے کام لینے والا طریقہ برا ہے، جن لوگوں نے ایٹم بم بنایا یا جو لوگ قوانین بناتے ہیں اور جنہوں نے اس سلسلے میں جدوجہد کی اور اجتہاد کیا وہ یہ بات بھی بخوبی جانتے ہیں کہ قانون اپنی ذات میں خیر ہے لیکن اس کے استعمال کا طریقہ کبھی اسے تمام قوانین کے خلاف بغاوت بنا دیتا ہے اس تمام بحث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیاسی جرائم جاری رہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والے سزا سے بچے رہیں۔ کیونکہ انسان کبھی معصوم نہیں ہوتا اس لئے اس کا فیصلہ اس بھی زیادہ سخت ہونا چاہیئے شاید یہ بات فراموش کر دی گئی ہے کہ پاکستان کو اپنے وجود، بقا اور ترقی کے لئے جناب بھٹو کے سر کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ان شکست خوردگی کے حالات اس فکر، اس پسماندگی اور سیاسی اور معاشرتی بحران میں جو پاکستان کے بانی کی وفات کے بعد سے نگل رہا ہے ایک ایسے قائد کی ضرورت ہے جو قرآن حکیم کے اس قول سے آگاہ ہو اور اسے اپنائے کہ عفو و درگزر کرنا حق سے زیادہ عظیم ہے پاکستان کو ان حالات میں اسکولوں، کارخانوں، یونیورسٹیوں سڑکوں ریلوے لائنوں اور ترقیاتی کاموں کی ضرورت ہے ان سب سے قبل اسے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہاں عوام کو حکومت، منصوبہ بندی اور مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں شرکت کی اجازت ہو اور ماضی کی سیاسی شکستوں اور معاشرتی پسماندگی کا عذاب کم کیا جائے۔ اور جناب بھٹو کا سر ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنرل ضیا اپنے ماسبق کے عدم وجود کے پیچھے پناہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے جنرل ضیا پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں یا وہ اپنی حکومت کے خاتمہ سے قبل یہ ثابت کریں کہ وہ اپنے ملک کو وہ کچھ دے سکتے ہیں جو جناب بھٹو نے دیا تھا۔

بی بی سی ٹیلی ویژن پر مباحثہ

بھٹو کو سزا دی گئی تو پوری دنیا میں دھماکہ ہوگا

برطانوی ذرائع ابلاغ خصوصاً بی بی سی اور ٹیلی ویژن نے پاکستان کے بارے میں گزشتہ دنوں جو خبریں نشر کیں اور پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے۔ حکومت پاکستان نے ان کا نوٹس لیا۔ اور برطانوی حکومت سے احتجاج کیا۔ مسلم لیگ کے چوہدری ظہور الٰہی اور جماعت اسلامی کے ترجمان "جسارت" نے بھی برطانوی ذرائع ابلاغ کو ہدف تنقید بنایا۔ لیکن حکومت پاکستان، چوہدری ظہور الٰہی اور جسارت نے پاکستانی عوام کو نہیں بتایا کہ بی بی سی اور ٹیلی ویژن نے اپنے پروگراموں میں پاکستان کے بارے میں کیا کہا تھا۔ سب سے زیادہ اعتراض لندن ویک اینڈ ٹیلی ویژن کے پروگرام پر کیا گیا۔ اس پروگرام کے شرکاء جس میں پاکستانی سفارت خانے کے پریس قونصلر زبیر علی بھی شامل تھے، پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا، اپنے قارئین کو ان کے خیالات سے آگاہ کرنے کے لیے ہم روزنامہ "ملت" لندن کے شکریہ سے متنازعہ پروگرام کی رپورٹنگ شائع کر رہے ہیں (ادارہ)

لندن۔ یکم مئی (ملت رپورٹ) کل لندن ویک اینڈ ٹیلی ویژن کے پروگرام "ورلڈس ویک اینڈ مین"۔ پاکستان کی سیاسی صورتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ سب سے پہلے سندھ میں بغاوت ہوگی اور اگر فوج نے بغاوت کو کچلنے کے لیے کارروائی کی تو بھارت بھی فوجی مداخلت کرے گا اور سندھ کو بنگلہ دیش کی طرح ایک آزاد مملکت بنا دے گا اس کے نتیجے میں بلوچستان والے یکطرفہ اعلان آزادی کریں گے اور ایران بلوچستان پر قبضہ کر لے گا۔ اور آخر میں صوبہ سرحد پر افغانستان کا قبضہ ہو جائے گا۔

پاکستان کے بارے میں اس قسم کے سنگین خدشات جس پروگرام میں ظاہر کیے گئے اس میں ایوب حکومت کے سابق سیکرٹری اطلاعات مسٹر الطاف گوہر، ٹرانس نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو مسٹر اقبال احمد، مسٹر بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو، پاکستانی سفارتخانے کے پریس قونصلر زبیر علی اور کالعدم نیپ کے لیڈر خان عبدالولی خاں شریک تھے۔ سابق لیبر ممبر پارلیمنٹ مسٹر برائن والڈن نے جو ہر اتوار کو یہ پروگرام پیش کرتے ہیں مسٹر بھٹو کے انٹرویو سے اس پروگرام کو شروع کیا۔ یہ ان کا وہ انٹرویو تھا جو انہوں نے مارچ ۱۹۷۷ کے انتخابات سے قبل دیا تھا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ "میں ملک کے عوام کی طاقت پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ میں ان میں ایک نئی روح ایک نئی زندگی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اگر مجھے مزید چار یا پانچ سال تک حکومت کرنے کا حق مل گیا جس کا آئین کے تحت مجھے حق دیا گیا ہے تو پھر میں پاکستان کی ہیئت ہی بدلنے کا عزم کیے ہوں"۔

بھٹو نے غریب کو عزت دی اور آج ...

اس پروگرام میں سب سے زیادہ نشانہ پنجاب کو بنایا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ اقتدار اور طاقت پنجاب کے لوگوں کے ایک گروہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ ملک پر چھائے ہوئے ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں کے عوام اس صورتحال سے نجات چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسٹر الطاف گوہر نے بھی پروگرام کے مرکزی خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کا علاقہ ایسا ہے جس نے برطانوی راج کو تقویت دی تھی چونکہ برطانوی فوج میں سب سے زیادہ بھرتی پنجاب کے علاقے سے ہوتی تھی اس لیے پنجابی یہ سمجھنے لگے کہ وہ ایک جنگجو قوم ہیں۔ چنانچہ پنجاب کے لوگوں نے اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی کرایا اور اس کے عوض انگریزوں نے انہیں زمینداریاں اور جاگیرداریاں عطا کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پنجابیوں نے زیادہ تعلیم حاصل کی اور اس طرح ان لوگوں کے بیٹوں کو سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے بھی ملنے لگے۔

مسٹر الطاف گوہر نے جن کا اپنا تعلق بھی پنجاب سے

ہے اور جو اعلیٰ ترین سرکاری عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں اسی پروگرام میں ایک دوسرے موقع پر کہا کہ مسٹر بھٹو نے بھی پنجابیوں پر ہی بھروسہ کیا حالانکہ مسٹر بھٹو کو پتہ تھا کہ پنجاب کے لوگ اصل میں صرف بنیادی طور پر منتظمین ہوتے ہیں پنجابیوں کو سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے اور دوسرے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے سوا اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ مسٹر بھٹو نے پنجابیوں کے اس مخصوص طبقے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ انہوں نے پنجابیوں کے اس طبقے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تو میں اسے نہیں مان سکتا۔ انہوں نے پنجابیوں کے اس مخصوص طبقے میں جوڑ توڑ کیا۔ مختلف قسم کے لوگوں کو سامنے لاتے رہے مگر مسٹر بھٹو نے اپنے دور اقتدار میں اس طبقے کو ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ٹرانس نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو مسٹر اقبال احمد نے پاکستان کے موجودہ نظام سے سندھ کے عوام کی ناراضگی کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بتائی کہ سندھ میں جاگیرداروں زمینداروں کی گرفت سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ پنجاب کی اکثریت اور بھارت سے آنے والے مہاجرین کے ظلم کا شکار ہیں

مسٹر برائن والڈن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ سندھ میں ہندوؤں کی تعداد بھی کافی ہے۔ اس لیے ان کے تحفظ کا بہانہ بنا کر بھارت سندھ پر چڑھائی کر سکتا ہے۔ پروگرام میں بلوچستان کی بغاوت کا بھی تذکرہ کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ بلوچستان

ایک اور بنگلہ دیش
کسی اور بنگلہ دیش
بھارت
افغانستان اور ایران
کی دلچسپی

میں سرداروں کی بغاوت کے دوران پاکستان کے اتنے ہی فوجی مارے گئے تھے جتنے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے سلسلے میں مارے گئے تھے مسٹر برائن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہاں مسٹر بھٹو نے سیاسی طریقہ کار اختیار کرنے کی بجائے فوج کو استعمال کیا جو ایک غلطی تھی۔ یہاں مسٹر مرتضیٰ بھٹو کا خیال یہ تھا کہ بلوچستان میں مسلح بغاوت کا مقابلہ نہ کیا جاتا تو ملک ٹوٹ جاتا۔ کوئی بھی حکومت اپنے دائرۂ اختیار کو چیلنج برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر بلوچستان کے لوگ بھی سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرتے، ہڑتالیں مظاہرے وغیرہ ہوتے تو اسی قسم کی جوابی کارروائی کے ذریعے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا مگر انہوں نے گوریلا جنگ کی اور حکومت کو امن عامہ برقرار رکھنے کے لیے فوج بھیجنا پڑی۔ اس سلسلے

بھٹو کے مخالفین، زبردست حامی بن گئے ہیں

ہیں انہوں نے آئرلینڈ کی مثال پیش کی جہاں امن عامہ قائم رکھنے کے لیے برطانوی فوج کو بھیجا گیا ہے۔

مسٹر والڈن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جنرل ضیاء اور ان کے جن ساتھیوں نے اقتدار پر قبضہ کیا ہے وہ بھی ملک کو متحد رکھنا چاہتے ہیں مگر جب انہوں نے مسٹر بھٹو کو ہٹایا تو ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ اس موقع پر مسٹر اقبال احمد نے کہا کہ فوج کے جن افسروں نے اقتدار پر قبضہ کیا ہے وہ اس زمانے میں جوان ہوئے تھے۔ جب پاکستان بننے والا تھا اس وقت کی سیاست میں مذہب کا اثر شدید تھا اور ان لوگوں کے نظریات کو فرقہ واریت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسٹر مرتضیٰ بھٹو نے اس موقع پر کہا کہ جنرل ضیاء اور ان کے ساتھی صرف اقتدار چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں.... کو اقتدار کا لالچ پڑ چکا ہے۔ اس مرتبہ یہ پہلا موقع تھا کہ ملک میں ایک جمہوری حکومت موجود تھی جس کے اختیارات پر کنٹرول کرنے کے ادارے موجود تھے۔ لوگ جوابدہ تھے۔ کوئی شخص کل اختیار کا مالک نہیں تھا۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے وہ لامحدود اختیارات چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک جمہوری حکومت کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد جب مسٹر برائن والڈن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ جنرل ضیاء اقتدار چھوڑنے والے نہیں تو ملک میں گڑبڑ کے واقعات ہونے لگے۔

ان واقعات کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے پاکستانی سفارتخانے کے پریس قونصلر مسٹر زبیر علی نے کہا کہ بعض لوگوں نے جو اقلیت میں تھے حکومت کے خلاف نفرت کی کوشش کی۔ ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اور تخریب کاری کے واقعات بھی ہوئے چنانچہ فوجی حکومت کو یہ احساس ہوا کہ پہلے والی نرم پالیسی نہیں چلے گی۔ لہٰذا امن عامہ قائم کرنے کے لیے زیادہ سختی شروع کر دی گئی ہے۔

اس مرحلے پر لوگوں کو کوڑے لگتے ہوئے دکھائے گئے اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اس قسم کے واقعات کی وجہ سے لوگ فوجی حکومت کے اور زیادہ خلاف اور مسٹر بھٹو کے اور زیادہ حامی ہو گئے ہیں۔ ان کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر اقبال احمد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پاکستان جیسے ملک میں غریب کی کوئی عزت نہیں اسی طرح انہیں تحفظ کا احساس بھی نہیں ہے۔ بھٹو حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے غریب کو عزت اور وقار کا نام دیا اور اب لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بھٹو کو ہٹانے کے بعد ان سے ان کی عزت اور وقار کو پھر چھینا جا رہا ہے۔ غریبوں میں اس احساس کی وجہ سے بھٹو آج عوام میں پہلے سے زیادہ مقبول ہے۔

مارشل لاء کے بہانہ قوانین کے تحت جن لوگوں کو سرعام کوڑے مارے جاتے ہیں یا سرعام پھانسی دی جا رہی ہے وہ یا غریب ہیں یا ان کا تعلق مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی سے ہے چنانچہ لوگوں کو صورتحال کا اچھی طرح علم ہو چکا ہے۔

پروگرام میں اس کے بعد ستمبر ۷۷ء میں قتل کے الزام میں مسٹر بھٹو کی گرفتاری اور ہائی کورٹ سے انہیں پھانسی کی سزا ملنے کا ذکر کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ مسٹر بھٹو نے شروع سے ہی یہ کہہ کا ذکر کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ مسٹر بھٹو نے شروع سے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ اور انہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر اس میں ملوث کیا گیا ہے۔ یہاں مسٹر مرتضیٰ بھٹو نے مقدمے کی نوعیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کے والد کے خلاف مقدمہ چلانے والی بنچ کے صدر (مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین) نے گواہوں کو دھمکیاں دیں۔ انہیں مرعوب کیا ....

.... چنانچہ جب یہ یقین دلایا گیا کہ عدالت میں منصفانہ طریقے سے مقدمہ چلے گا تو میرے والد نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ مجھے عدالت کی اس بنچ سے انصاف کی توقع نہیں ہے۔ کوئی اور بنچ مجھے منظور ہو گی مگر یہ بنچ نہیں۔ کیونکہ اس کے ججوں نے پہلے ہی میرے خلاف اپنے رویے کا اظہار کر دیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر والڈن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگرچہ پاکستان کی سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت شروع ہونے والی ہے مگر مبصرین کو یقین

ہے کہ یہ سپریم کورٹ مسٹر بھٹو کو سزا کی توثیق کر دے گی۔ اور مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی جائے گی۔

مسٹر والڈن نے کہا کہ مسٹر بھٹو جیل میں ہوں یا اس سے باہر اس وقت وہ ملک کے مقبول ترین لیڈر ہیں اور اگلے ہفتے انتخابات کرا لیے جائیں تو پاکستان کے عوام بھاری اکثریت سے ان کے حق میں فیصلہ دیں گے۔ اس کی وجوہ پر مسٹر اقبال احمد نے روشنی ڈالی اور کہا کہ اس وقت پاکستان کے عوام بھٹو کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کہا گزشتہ سال مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اور اب میں حال ہی میں پاکستان کے دورے سے واپس آیا ہوں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ مزدور اور کسان بھی جو مسٹر بھٹو کے مخالف ہوا کرتے تھے۔ آج پوری طرح ان کے ساتھ ہیں۔ مسٹر اقبال نے کہا کہ اگر مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ تو خصوصاً سندھ میں بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ سندھ کے لوگ بنیادی طور پر بغاوت پسند ہوتے ہیں۔ بغاوتوں سے ان کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور پنجاب اور بھارت سے آنے والے مہاجرین کے چنگل میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں جب مسٹر بھٹو خود بھی سندھی ہیں ان کی شہادت کا نشان بن جائے گا۔ تو پھر نہ صرف لاوا پھوٹ سکتا ہے بلکہ اس وقت فوج سندھ میں فوجی کارروائی کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے اور جب یہ مدافعت ہو گی تو وہی صورتحال پیدا ہو جائے گی جو بنگلہ دیش بننے کے وقت تھی۔

مسٹر برائن والڈن نے پاکستان میں نام نہاد قومی حکومت کے قیام کا ذکر کیا تو مسٹر زبیر علی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جنرل ضیاء الحق قومی حکومت بنانے کی اس لیے کوشش کر رہے

پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا خسارہ

اسلام آباد کے باخبر حلقوں کے مطابق ماہ جون میں ختم ہونے والے مالی سال میں پاکستان کو تجارت میں ۵۰۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہونے کا امکان ہے۔ پاکستان کی ۳۱ سالہ تاریخ میں یہ سب سے بڑا خسارہ ہو گا۔

(آئرلیش ٹائمز، ڈبلن — ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء)

ہیں تاکہ ملک کے سیاستدان ملک چلانے کی ذمہ داریاں بھی قبول کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انتخابات کرائے بغیر ایک نمائندہ حکومت قائم کر دی جائے۔ فوجی حکومت عوام کے نزدیک نہیں ہے جبکہ سیاستدان عوام کے نزدیک ہوتے ہیں۔ لہٰذا جنرل ضیاء یہ چاہتے ہیں کہ انتخابات تک اقتدار میں سیاستدانوں کو بھی شریک کر لیا جائے۔ مسٹر برائن والڈن نے کہا کہ سیاستدانوں کو اقتدار میں شامل کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جنرل ضیاء پر ڈکٹیٹر اور ظالم کا جو ٹھپہ لگ چکا ہے وہ اس سے بچ جائیں گے۔ مگر اس میں بھی انہیں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی۔ جب انہوں نے ایسے لوگوں کو تلاش کیا جن کی سیاست میں کوئی وقعت ہو۔ مسٹر بھٹو کی سب سے بڑی مخالف جماعت نیشنل عوامی پارٹی کو ڈھونڈا گیا مگر نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر ولی خان جنرل ضیاء کی ایسی کسی حکومت میں شریک ہونے کو تیار نہیں ہیں۔

اس موقع پر ولی خان کا ایک انٹرویو دکھایا گیا جو لندن میں گذشتہ ہفتے کیا گیا تھا۔ اس انٹرویو میں ولی خان نے کہا اگر حکومت یعنی مارشل لاء حکام اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں عام انتخابات کے لیے ماحول سازگار ہے اور حکومت سیاستدانوں کے حوالے کی جا سکتی ہے تو پھر ان کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ وہ انتخابات کرائیں اور عوام کا فیصلہ حاصل کریں۔ اس فیصلے کے بعد جو حکومت بنے گی صرف اسے ہی قومی حکومت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مارشل لاء کے حکام یہ سمجھتے ہیں کہ انتخابات کے لیے حالات سازگار نہیں تو پھر انہیں اپنا مارشل لاء جاری رکھنا چاہیئے۔ لیکن ان حالات میں قومی حکومت نہیں بن سکتی۔ یہ حکومت کوئی منتخب حکومت نہیں ہوگی۔ یہ ایک نامزد حکومت ہوگی اور اس کی حیثیت مشیروں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ہماری سیاست اس قسم کی صورتحال سے متفق نہیں ہو سکتی ہم یقینی طور پر اس قسم کی حکومت میں موجود نہیں ہوں گے۔

آخر میں مسٹر برائن والڈن نے کہا کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد جہاں پاکستان میں بغاوت ہوگی وہاں نہ صرف ایران افغانستان اور بھارت جیسے ہمسایہ ملک اس میں الجھ جائیں گے بلکہ چین اور روس کی جانب سے مداخلت کا خطرہ ہے اور اس طرح دنیا کے سامنے ایک دھماکہ خیز صورتحال آجائے گی۔

❀❀

کوڑوں اور سخت سزاؤں کے باوجود صحافیوں کی تحریک جاری ہے

ایشیا ویک - ۲۶ مئی ۱۹۷۸ء

پچھلے ایک ماہ سے پاکستانی صحافی ایک ایسی جدوجہد میں مصروف ہیں جو اس صورت میں نمایاں حیثیت اختیار کر جاتی ہے اگر حالیہ اچھل کود میں برصغیر میں ان کے ہم پیشہ لوگوں سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ اس ایمرجنسی کے دوران جسے اب ہندوستانی بڑی بہادری کے ساتھ "ایمرجنسی کی کالی رات" کہتے ہیں۔ اس ملک میں ایک بھی اخبار نویس جابر حکومت کے آہنی ہتھکنڈوں کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے صحافی جتھوں کی صورت میں گرفتاریاں پیش کر رہے ہیں اس کے باوجود کہ ان کی حکومت انہیں کوڑوں سمیت غیر ضروری طور پر سخت سزائیں دے رہی ہے۔

ایسی سختی اسلام آباد کے فوجی حکمرانوں کے لیے منفی اثرات ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اخبار نویسوں کے لیے وسیع پیمانے پر ہمدردیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی پہل کاری اپنے مخالفین کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ صحافیوں کا احتجاج معطون سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ایک اخبار پر پابندی لگنے کے نتیجے میں گروہی بنیاد پر شروع ہوا۔ اس احتجاج کے سلسلے میں غلط رویہ اختیار کر کے حکومت نے اسے جماعتی سیاست سے بلند و بالا ایک قومی مسئلے کی صورت دیدی ہے۔

کچھ سچ کچھ جھوٹ

گٹر ڈھکن اور ہم
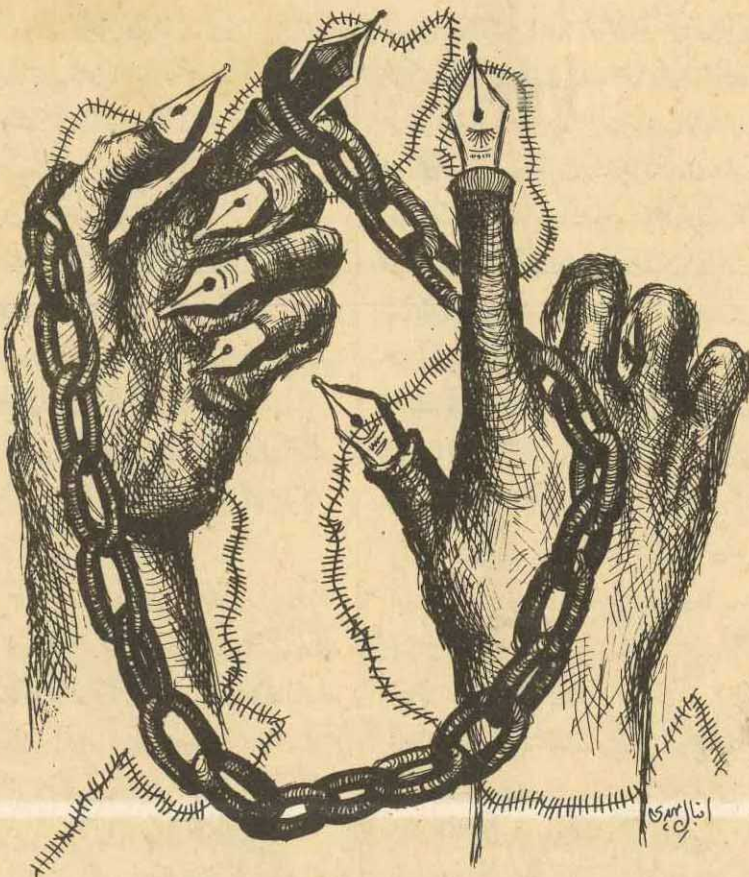
امر جلیل

ہمارا ایک دوست گٹروں کے ڈھکن چراتا ہے۔ ایک روز اسے ڈانٹتے ہوئے میں نے کہا۔ "ابے فلنٹوش تو بڑا ذلیل ہے۔"

فلنٹوش نے کہا۔ خدا کی قسم میں چڑھتے سورج کا پجاری نہیں ہوں۔ میں تو ایک بے ضرر سا آدمی ہوں۔ رفاہی کام کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ابے تجھے شرم نہیں آتی۔ تو گٹروں کے ڈھکن چراتا ہے۔"

فلنٹوش نے کمال بے نیازی سے کہا۔ "یار میں ڈھکن چراتا ہوں۔ کسی کی عزت تو نہیں چراتا کہ تم مجھے ذلیل کر رہے ہو۔"

"ابے ڈھکن کے بچے!" میں نے کہا۔ "گٹروں کے ڈھکن چرانا کوئی اچھی بات ہے۔"

"کیوں اچھی بات نہیں ہے۔" فلنٹوش نے کہا۔ "لگتا ہے فلسفے کا مطالعہ تم نے ترک کر دیا ہے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "ابے ڈھکن چرانے کا بھلا فلسفے سے کیا تعلق ہے۔"

"بہت قریبی تعلق ہے۔" فلنٹوش نے کہا۔ "یہ الگ بات ہے کہ تم نے دنیا کی ہر برائی میں اچھائی کا پہلو تلاش کرنے کی جستجو ترک کر دی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کہ دنیا کی ہر برائی میں اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا "مثال کے طور پر کھٹی ڈکار کے بعد وٹامن سی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور انڈا جب گندا ہو جاتا ہے تب مارنے کے کام آتا ہے۔ لیکن یار فلنٹوش گٹر کے ڈھکن چرانے میں مجھے تو کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔"

فلنٹوش نے کہا یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل اٹھے۔"

"رومنٹک بننے کی کوشش سے باز آجا۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے بتا کہ گٹروں کے ڈھکن چرانے میں اچھائی کا کونسا پہلو مضمر ہے۔"

"ایک شرط پر بتانے کو تیار ہوں۔" فلنٹوش نے کہا۔ "وہ کیا۔" میں نے پوچھا۔

فلنٹوش نے کہا۔ "ایک عدد غیر سیاسی بیان دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

فلنٹوش کی چالاکی میں بھانپ گیا۔ غیر سیاسی بیان کو بھائی لوگ سیاسی بیان تصور کرنے لگے ہیں اور سیاسی بیان کو غیر سیاسی بیان! لہٰذا میں غیر سیاسی بیان دے کر کوئی مصیبت مول لینے کو تیار نہیں۔ میں نے فلنٹوش سے کہا۔ "مجھے چند لمحوں کی مہلت دو یار چند لمحوں میں انشاء اللہ تعالیٰ میں اس راز کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" فلنٹوش نے کہا۔ "تم انہماک سے سوچو اور چکن کا دل کلیجی کھاؤ۔ میں چکن کی ٹانگ کھاتا ہوں۔"

فلنٹوش چکن کھانے لگا اور میں چکن کا دل۔ اگلے وقتوں کے لوگ چکن کا دل نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس بات کو معیوب سمجھتے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب لوگ رات کی تاریکی میں بناسپتی گھی کا ڈبہ چھپتے چھپاتے خرید کر لاتے تھے اور دن میں خالص گھی کی نعمتوں کا ذکر کرتے تھے۔ یہ جنریشن گیپ کی باتیں ہیں۔ اب مرغی کا دل اور کلیجی کھانا معیوب تصور نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کے اپنے دل مرغی کے دل کے برابر ہو گئے ہیں۔ خالص دیسی گھی کھانے والوں کے نام محکمۂ آثار قدیمہ سے دستیاب ہونے لگے ہیں۔ میں مرغی کا دل کھانے لگا اور گٹروں کے ڈھکن چرانے کے درپردہ جو اچھائی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسکول میں استاد صاحبان نے یہ بات زور دے کر ہمیں ذہن نشین کرائی تھی کہ دنیا کی ہر برائی میں اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے، بڑے بال رکھنے سے گو کہ سر میں جوئیں پڑ جاتی ہیں لیکن لوگ آپ کو دانشور تصور کرتے ہیں بارش اور سیلاب سے جب فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں تب بیوروکریسی سے ماہرین دنیا کی منڈیوں میں غلّے کا کھوج لگانے کے لئے بیرونی ملک جاتے ہیں اور وہاں سے اپنے لئے منیلا شرٹ اور اپنے بچوں کے لئے بولنے والا بندر لے آتے ہیں۔

فلنٹوش نے اچانک کہا۔ "یار گیدڑ۔ کچھ لوگ ہمارا اعتبار چرا لیتے ہیں، کچھ لوگ ہم سے ہمارا یقین چرا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ہم سے تنظیم چرا لیتے ہیں تم ان کو برا کیوں نہیں کہتے! اس لئے کہ وہ لوگ تمہارے دوست نہیں ہیں اور میں جو کہ صرف گٹروں کے ڈھکن چراتا ہوں مجھے گالیاں دیتے ہو اس لئے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔"

میں نے کہا۔ "گٹروں کے ڈھکن چرانے کے درپردہ مجھے کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔"

فلنٹوش نے کہا۔ "تیرا فلسفہ کمزور ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو مجھے کسی طور قائل کر دے۔ میں تیرا غلام ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تو میرا غلام ہو جا۔" فلنٹوش نے کہا۔ "میں کسی کو قتل کرنے کے بعد تجھے آزاد کر دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اب تو مجھے گٹروں کے ڈھکن چرانے کے مابین جو اچھائی ہے اس کے بارے میں کچھ بتا۔"

فلنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گٹروں کے ڈھکن چرانے کے بعد ہم چکن تکہ کھا سکتے ہیں۔ یہ اچھائی نمبر ایک۔"

"کیا مطلب!" میں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

فلنٹوش نے کہا۔ "جب پرانے ڈھکن چوری ہو جاتے ہیں یا چوری کرواتے جاتے ہیں تب نئے ڈھکن بنوانے کے دوران کئی افسران کی کفالت ہو جاتی ہے اور بیگمات از سر نو خریداری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کو تم اچھائی نمبر ۲ کہہ سکتے ہو۔"

میں نے تعجب سے فلنٹوش کی طرف دیکھا۔

فلنٹوش نے کہا "بغیر ڈھکن کے گٹر میں گر جانے کے بعد آدمی اخباروں میں سرخی کا سبب بنتا ہے اور کچھ عرصے تک گٹر میں رہنے کے بعد آدمی سیاست داں بن سکتا ہے۔"

میں نے سر پکڑ لیا۔

فلنٹوش نے کہا۔ "گٹر میں گر جانے کے بعد بچے بوڑھے اور جوان آسانی سے مر کھپ جاتے ہیں۔ اس طرح بغیر ڈھکن کے گٹر ملک کی آبادی کی روک تھام میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

فلنٹوش نے کہا۔ "خونخوار بیوی سے بچنے کے لئے آپ بغیر ڈھکن کے گٹر میں مزے سے قیلولہ کر سکتے ہیں۔"

میں فلنٹوش کی طرف دیکھتا رہا

فلنٹوش نے کہا۔ "لاٹھی چارج کے دوران لوگ بغیر ڈھکن کے گٹروں میں پناہ لے سکتے ہیں۔"

"بس فلنٹوش بس۔" میں نے فلنٹوش کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔ "آج سے میں تیرا غلام ہوں۔"

فلنٹوش نے کہا۔ "کسی کو قتل کرنے کے بعد میں تجھے آزاد کر دوں گا۔"

جس "چکی" میں غازی علم دین کو رکھا گیا تھا، اس کی چھت پر روشنی ہوتی ہے؟

غریب قیدیوں کا میلا وچھ پٹیائی کی جاتی ہے

میانوالی جیل - ۱۹ مئی ۱۹۷۸ء

میرے دوست، میرے بھائی، میرے ہمدم

کہو کس حال میں ہو، تمہیں تابڑ توڑ خط لکھ رہا ہوں اور یہ غالباً تیسرا خط ہے، اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ اس طرح کچھ باتیں کر لیتا ہوں اور یہ کہاوت تو مشہور ہے کہ خط سے نصف ملاقات ہو جاتی ہے۔

آج جمعہ ہے اور ہماری مشقت کی چھٹی ہے لیکن تمہیں معلوم نہ ہوگا کہ میرے اور دیگر چھ ساتھیوں سے مختلف قسم کی مشقتیں لی جا رہی ہیں۔ امروز ملتان کے ساتھی حشمت وفا اور میرے حصے میں دری بننے کی مشقت آئی ہے۔ یہ مشقت زمین پر بچھانے والی دری بننے کی ہے۔ عصمت دری کی نہیں، مبادا تم غلط سمجھو تو۔

کل یعنی جمعرات کو ہماری مشقت کا پہلا دن تھا۔ اور آج چھٹی تھی۔ آج کا دن بہت اچھا گذرا۔ اور تمام دن گذارنے کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آج پیپلز پارٹی کے چند لوگوں نے ہمیں ناشتے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ صبح سویرے نہا دھو کر ان کی بیرک (بیرک - ۱۳) میں گئے۔ دیسی گھی سے بنے ہوئے حلوے اور چائے بسکٹوں کا ناشتہ کیا۔ خاصی دیر گپ شپ رہی۔ تقریباً دس بجے لاہور ٹیلی ویژن کے دوستوں نے موسیقی کی محفل سجائی۔ ان کے ساتھ بہت اچھی نشست رہی۔

گزشتہ خط میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ میانوالی جیل میں لاہور ٹیلی ویژن کے کئی دوست بھی بند ہیں۔ شاہد محمود ندیم کو تو تم جانتے بھی ہو۔ ٹی وی کے دوستوں کے حصے میں بھی مختلف نوعیت کی مشقتیں آئی ہیں اور ہر ایک نے سخت مشقت کر کے اپنے آدرش اور نظریات کی زکوٰۃ ادا کر دی ہے۔ بعض کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ کچھ کے ہاتھ زخمی ہیں لیکن حوصلے بلند ہیں۔ ان دوستوں کو بیرک نمبر ۱ میں رکھا گیا ہے۔ جہاں اور بھی بہت سے قیدی ہیں۔ میانوالی جیل میں ۵۶ بھارتی قیدی بھی ہیں۔ ان کو جاسوسی، اسمگلنگ اور ناجائز طریقے سے سرحد پار کرنے کے الزام میں چودہ، چودہ سال قید سخت کی سزائیں دی گئی ہیں۔ ان میں سکھ بھی ہیں۔ سو آج ان سکھوں نے مشرقی پنجاب کے گیتوں کا جادو جگایا۔ مہندر سنگھ، سیوا سنگھ، سردار پریم سنگھ اور رشیرا سنگھ نے لوک گیت اتنے خوبصورت انداز میں سنائے۔ کہ یقین ہی نہیں آتا کہ اسمگلروں اور جاسوسوں کو بھی اتنے اچھے گلے ملتے ہیں۔ ان کے دیگر ساتھیوں نے بھی آواز کا جادو جگایا۔ ایک صاحب نے جیل کی زندگی پر کئی گیت خود لکھے ہیں بلکہ بنائے ہیں۔ کیونکہ وہ پڑھنے لکھنے سے نابلد ہیں۔ یہ صاحب قتل کے جرم میں، ڈاکے اور دوسرے جرائم کا ارتکاب بھی کیا ہے لیکن سب نے محبت کے گیت سنائے۔ اور تم یقین جانو ان کے گلے سے سچے جذبے ابل رہے تھے۔ سو آج کا دن بھی گذر گیا اور بہت اچھا گذرا۔ آنے والا کل پھر ہماری مشقت کا دن ہے۔

مشقت میں یوں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم محنت کرنے کے عادی ہیں۔ جب "بڑی جیل" میں تھے تب بھی محنت مشقت کرکے پیٹ بھرتے تھے۔ قربانی کی کھالوں کی کمائی نہیں کھاتے تھے، لیکن "چھوٹی جیل" میں مشقت کے دوران قیدی کی جو تذلیل کی جاتی ہے اور اس سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے وہ بھی ناقابل بیان اور ناقابلِ برداشت ہے۔ ایک چھ فٹا کڑیل قیدی دن بھر محنت کرکے دس سیر مونجھ کوٹتا ہے۔ مونجھ کا کوٹنا سب سے کڑی مشقت ہے۔ یہ مشقت ٹیلی ویژن کے کچھ دوستوں اور ہمارے ایک ساتھی بشیر افگن (مساوات لاہور) کے حصّے میں بھی آئی ہے) اس قیدی کو میرے قد اور تمہارے جثّہ کا وارڈن ہر شام گندی گالیاں دیتا ہے۔ ڈنڈے یا چمڑے کی بیلٹ سے پٹائی کرتا ہے۔ ایسا سلوک صرف اسی قیدی سے نہیں بلکہ متعدد قیدیوں سے کیا جاتا ہے خصوصاً ایسے قیدیوں کے ساتھ جنہیں پشت پناہی حاصل نہیں ہوتی۔ بھارتی قیدیوں سے بھی یہی سلوک برتا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو بھارتی قیدی اجرت پر دوسروں کی مشقت بھی ادا کرنے لگے ہیں تاکہ کچھ پیسے جمع کر سکیں۔

گذشتہ دنوں میانوالی سے تعلق رکھنے والے دس چھوٹے زمیندار جیل میں لائے گئے۔ معلوم ہوا کہ پانی کے مسئلے پر ان کا ایک ریٹائرڈ میجر سے کچھ اختلاف ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ دفعہ ۱۰۹ کے تحت مقدمے میں جیل یاترا کی صورت میں نکلا۔ دوران اسیری ان کی جو تذلیل کی گئی۔ اس کا اندازہ "بڑی جیل" والے نہیں لگا سکتے۔ اسی طرح ایک ہفتے قبل ۱۳ قیدی آئے تھے۔ جن کا پیشہ ماہی گیری تھا۔ اور وہ میانوالی کے قریب دریائے سندھ سے ایک ٹھیکے دار کے لیے مچھلیاں پکڑتے تھے انہوں نے ٹھیکے دار سے مچھلیوں کے نرخ میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ اور اس کے نتیجے میں ان غریبوں کو چار دن میانوالی جیل میں بسر کرنے پڑے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے "ملاحظہ" (یہ "ملاحظہ" کیا ہے پھر کبھی بتاؤں گا) کے وقت جیل کے اسٹاف نے انہیں تھپڑ مارے۔ پھر ان سے سخت مشقت لی گئی۔ اذیتیں دی گئیں۔ زدوکوب کیا گیا۔ جیل کے ساتھیوں نے بتایا کہ ان مچھیروں پر جو کچھ بیت رہی ہے سو بیت رہی ہے۔ ان کے بیوی، بچے ان سے زیادہ سخت اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کی بیوی، بیٹی یا بہن کو پنجاب کے کسی بازارِ حسن بھیجا جا چکا ہو۔

میانوالی جیل کو "قصوری جیل" کہا جاتا ہے۔ اس جیل میں ان قیدیوں کو بھیجا جاتا ہے جن کا جرم سنگین نوعیت کا ہو یا حکومت سخت سزا دینا چاہتی ہو۔ پرانے قیدی بتاتے ہیں کہ آج سے چھ ماہ قبل یہ جیل واقعی بڑی ہولناک تھی لیکن جب سے اربابِ اقتدار کی نوازش سے پیپلز پارٹی کے بہت سے سیاسی قیدی یہاں آئے ہیں۔ ان کے احتجاج کی وجہ سے آہستہ آہستہ غیر قانونی سختیاں ختم ہو رہی ہیں۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ میانوالی جیل کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کروں لیکن ابھی تک کسی مستند معلومات رکھنے والے قیدی سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ویسے یہ وہی جیل ہے جہاں غازی علم دین کو پھانسی دی گئی تھی۔ غازی علم دین کو چکی - ۲۵ میں رکھا گیا تھا جہاں کچھ لوگوں نے بتایا کہ مخصوص تاریخوں میں چکی - ۲۵ کی چھت پر روشنی ہوتی ہے۔ دھماکے ہوتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس جیل میں مہاتما گاندھی غفار خان اور دیگر سرکردہ کانگریسی اور احراری رہنما بھی رہ چکے ہیں۔

ویسے میانوالی جیل واقعی "قصوری جیل" ہے۔ لاہور سے اڑھائی سو میل دور، ہر طرف سے کٹی ہوئی، الگ تھلگ جیل میں ڈاکٹر بھی نہیں۔ ہماری بیرک کے ساتھ ہی پھانسی گھاٹ ہے جس میں دس قیدیوں کی گنجائش ہے۔ لیکن اس وقت تیس افراد بند ہیں اور وہ سب پھانسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی قیدی گذشتہ پانچ سال سے منتظر ہیں۔ ان کے بیوی بچے ملاقات کے لیے آتے ہیں تو بین کی آوازیں آتی ہیں۔ نہ پوچھو دل پر کیا گذرتی ہے۔

جیل میں فرنیچر بھی بنتا ہے۔ سوت بھی کاتا جاتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور پھول دار دریاں بنتی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں حکام بالا اور بیوروکریسی کے لیے ہوتی ہیں۔ قیدیوں کو تو سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا بھی نہیں ملتا۔ کھانے کے نام پر جو چیز ملتی ہے اگر تم اسے صرف دیکھ ہی لو، تو فوراً قے کر دو۔

بہرحال ان تمام معروضی حقائق کے باوجود ہمارا دل اس جیل میں لگ گیا ہے۔ ابھی میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ اگر یہاں سے گرمی، مکھیوں اور مچھروں کو نکال دیا جائے تو میں یہاں پر نو سال تک رہ سکتا ہوں۔ دوستوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔ پڑھنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا ہے اور ہم نے تو یہاں پر نو ماہ گزارنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی تحریک کے بارے میں ہمیں اطلاعات نہیں ملتیں۔ پہلے تو بی بی سی ہماری تحریک کے بارے میں نمایاں طور پر خبریں نشر کرتا تھا۔ اور تبصرے

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

تخفیف اسلحہ • جنرل اسمبلی کا اجلاس

عبدالمجیب خان

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد پاکستان کا جھکاؤ صنعتی ملکوں کی جانب ہو گیا

تخفیف اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ایک خصوصی اجلاس ان دنوں نیویارک میں ہو رہا ہے جس میں اقوام متحدہ کے ایک سو انچاس اراکین شرکت کر رہے ہیں۔ اس اجلاس سے بیس سے زیادہ سربراہان مملکت اور سربراہان حکومت خطاب کریں گے۔ جن میں بیشتر کا تعلق تیسری دنیا سے ہے۔ گزشتہ پچاس برس میں تخفیف اسلحہ کے بارے میں یہ سب سے بڑی عالمی کانفرنس ہے اس سے قبل ۱۹۳۲ء میں بھی اسی طرح کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اور بین الاقوامی سطح پر مہلک ہتھیاروں کا فروغ بڑھتا رہا۔ اسٹاک ہوم کے بین الاقوامی امن ریسرچ ادارے کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق صرف ۱۹۷۷ء میں عالمی فوجی اخراجات چار ہزار ملین ڈالر تھے۔ ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں اس شرح میں دوگنا اضافہ ہوا ہے اور یہ افریقہ کی داخلی پیداوار کا بھی دوگنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اس مجموعی سرکاری ترقیاتی امداد سے بیس گنا زیادہ ہے جو ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے ترقی پذیر ملکوں کو دی گئی، لہٰذا فوجی اخراجات میں زبردست اضافے کے پیش نظر تخفیف اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کے تحت خصوصی کانفرنس کو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے سیاسی مبصرین خصوصی اہمیت دے رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے تیسری دنیا کے ملکوں کے بھرپور پریشر کے تحت طلب کیا گیا ہے جو بڑی طاقتوں کے درمیان ابھی

1977 کے عالمی فوجی اخراجات

4 ہزار ملین ڈالر

ہتھیاروں کی دوڑ کی وجہ سے اقتصادی مسائل کی چکی میں پیس رہے ہیں۔ دوسرے مہلک ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے کم ترقی پذیر ملکوں کی سیاسی آزادی اور قومی سلامتی کو بھی خطرہ لاحق ہوتا جارہا ہے۔

اسٹاک ہوم بین الاقوامی امن ریسرچ ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیان چار بڑے ملکوں نے تیسری دنیا کو نوے فیصد جدید ہتھیار فراہم کیے اور اس طرح تیسری دنیا میں ہتھیاروں کی خریداری پر اخراجات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے ان چار ملکوں میں خاص کر امریکہ نے اڑتیس فیصد، روس نے چونتیس فیصد اور برطانیہ اور فرانس نے نو فیصد ہتھیار فراہم کیے ۱۹۷۷ء میں مشرق وسطےٰ کے ملکوں نے تیسری دنیا کے مجموعی ہتھیاروں کی درآمدات کا پچاس فیصد سے بھی زیادہ درآمد کیا اس وقت ترقی پذیر ممالک ایک جدید ترین میزائل بردار جہاز خریدنے پر جتنی رقم ادا کرتے ہیں اس قدر رقم گزشتہ دس برسوں میں عالمی صحت کے ادارے نے ترقی پذیر ملکوں میں صحت عامہ کے منصوبوں میں بطور امداد فراہم کی ہے۔ اگر عالمی سطح پر جدید ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکا جاتے تو یہ رقم تیسری دنیا میں بسنے والے کروڑوں عوام کی فلاح وبہبود کے منصوبوں میں بروئے کار لائی جاسکتی ہے اور اس سے عالمی امن کے فروغ میں بھی مدد ملے گی۔

لیکن جدید ہتھیاروں کی دوڑ سے آج ترقی پذیر ممالک سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ اور جس کی وجہ سے انہیں اقتصادی طور پر شدید زبوں حالی کا سامنا ہے۔ جناب بھٹو نے تیسری دنیا کے بلاک کو متحرک بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے جسے آج بھی تیسری دنیا کے ممالک خراج تحسین پیش کر رہے ہیں یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا ترقی پذیر ملکوں کی زبوں حالی کو محسوس کر رہی ہے۔ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا تخفیف اسلحہ کے بارے میں خصوصی تاریخ ساز اجلاس اس بات کی ایک واضح علامت ہے۔ یہ تجویز سب سے پہلے جناب بھٹو نے تیسری دنیا کے سربراہوں کی کانفرنس بلانے کے سلسلے میں پیش کی تھی جب میں بین الاقوامی اقتصادی بحران اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو محدود کرنے کے بارے میں تیسری دنیا کے یکساں موقف اختیار کرنے کو اہمیت دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں جناب بھٹو نے بارہا اپنی تقریروں اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے اقوام متحدہ سے بحر ہند کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کا

(باقی صہ۲۶ پر)

منہاج برنا

نثار عثمانی

اخباری کارکنوں کی تاریخی جدوجہد

تحریر:- احفاظ الرحمان - جنرل سیکرٹری - کراچی یونین آف جرنلسٹس

خواجہ صاحب! آپ تو قائدِ اعظم کے دشمنوں کے دوست بن چکے ہیں

پی۔ یو۔ جے اور ایپنک کے "رفیق باجوؤں" سے کام نہیں چلے گا

جب سے آل پاکستان نیوز ایمپلائز کنفڈریشن (ایپنک) اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (پی ایف یو جے) نے اپنے آٹھ نکاتی مطالبات کی منظوری کے لئے پُر امن احتجاجی بھوک ہڑتال شروع کی ہے۔ سرکاری مشینری اخباری کارکنوں کے خلاف حرکت میں آگئی ہے سرکاری کنٹرول میں چلنے والے ابلاغ عامہ کے ذرائع، ریڈیو ٹیلیویژن نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات اور وہ اخبارات و جرائد جو ان سیاسی جماعتوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو مارشل لا کے حامی ہیں، جو صرف اپنی جماعتوں کے لئے اظہار اور صحافت کی آزادی چاہتے ہیں، اور دوسروں پر اس کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں، اس مہم میں ۲۰ مئی کے بعد خصوصیت سے زور پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اس وقت سے جب سے حکام نے ایپنک اور پی ایف یو جے کے بیشتر سرکردہ منتخب عہدہ داروں اور نمائندوں کو مارشل لا ضوابط کے تحت جیلوں میں ٹھونس دیا ہے اور اخباری کارکنوں میں سے چار "رفیق باجوے" تلاش کر کے ان سے مذاکرات کا ڈھونگ رچایا ہے۔

ایپنک اور پی ایف یو جے اور ان کی قیادت کے خلاف حقائق کو مسخ کرنے اور بہتان تراشی کی جو مہم چلائی گئی ہے۔ ان میں ٹرسٹ کے اخبارات کے علاوہ جماعت اسلامی کے ہمنوا اور ترجمان اخبار "جسارت" اور ہفت روزہ جریدے "زندگی" اور "بادبان" پیش پیش ہیں۔ لیکن یہ قابلِ معافی ہیں۔ یہ آج سے نہیں گزشتہ کئی سالوں سے پی ایف یو جے دشمنی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پی ایف یو جے کو جماعت اسلامی کی ایک فرنٹ آرگنائزیشن بنانا چاہتے ہیں۔ اور صحافیوں کی اکثریت نے ہمیشہ کسی سیاسی جماعت کا دم چھلا بننے سے انکار کر دیا ہے۔ لہٰذا ان اخبارات کی گالیوں کا کیا جواب ـــ البتہ ہمیں تعجب خواجہ محمد صفدر جیسے محترم بزرگوں پر ہوا کہ وہ بلا سوچے سمجھے پی ایف یو جے اور ایپنک کے خلاف میدان میں اتر پڑے ہیں۔

جناب صفدر صاحب نے "نوائے وقت" کی ۲۳ مئی کی اشاعت میں ایک مضمون "صحافت کی آزادی اور مساوات" کے عنوان سے قلم بند فرمایا ہے اور اس میں مارشل لا حکومت کی تائید کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ ایپنک اور پی ایف یو جے کی تحریک "محض سیاسی چال ہے اور آزادی صحافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں"۔ یہی بات مارشل لا حکومت بھی کہہ رہی ہے اور وہ سیاسی عناصر بھی جو اس کے حامی ہیں اور وہ بھی جو "مساوات" کی بحالی کے اس لئے مخالف ہیں کہ وہ ایسی جماعت کا پرچہ ہے جو اس دور میں حزب اختلاف بن گئی ہے کیونکہ وہ اقتدار سے محروم ہے۔ اس لئے وہ بڑی آسانی سے ایپنک اور پی ایف یو جے اور مساوات کے کارکنوں پر یہ الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ ساری تحریک پیپلز پارٹی کے لئے اور اسی کے اشاروں پر چلائی جا رہی ہے لیکن یہ الزام لگاتے ہوئے وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ ایپنک اور پی ایف یو جے کے منتخب عہدہ داروں کی اکثریت ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جنہوں نے ہر دور میں آزادی صحافت کے لئے اصولی جدوجہد کی ہے اور خصوصیت سے پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں سب سے بڑھ چڑھ کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود خواجہ صفدر صاحب اور ان کے ہم خیال سیاسی مسلک کے بار بار یہ اعتراض دہراتے ہیں کہ پی ایف یو جے اور ایپنک (ایپنک باضابطہ جنوری ۷۶ء میں قائم ہوئی ہے اس سے پہلے ۱۹۷۳ء میں اس کی پیشرو سنٹرل ایڈہاک کمیٹی فار نیوز پیپر ایمپلائز یونین قائم کی گئی تھی) نے بھٹو کے دور میں جسارت، حریت، مہران، زندگی اور اردو ڈائجسٹ کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہم یہاں یہ سوال تو نہیں اٹھاتے کہ آزادی صحافت اور اظہار کے لئے اس دور میں مسلم لیگ یا آج کی قومی اتحاد کی جماعتوں نے کیا تحریک چلائی، کون سی بھوک ہڑتال کی یا گرفتاریاں دیں۔ البتہ مودبانہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اگر کسی جماعت نے اپنی محدود نفری اور وسائل کی کمیابی کے باوجود اظہار اور آزادیٔ صحافت کے لئے کوئی احتجاج کیا کوئی کام کیا ہے کوئی جدوجہد کی ہے تو وہ پی ایف یو جے ہی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ آج کی طرح ہر دور میں حکمراں جماعت نے پی ایف یو جے پر حزبِ اختلاف کا آلۂ کار ہونے کا الزام لگایا ہے اور اس کے رہنماؤں کو ملک دشمن اور کمیونسٹ گردانا ہے۔ ہمارے یہاں غداری، ملک دشمنی، پاکستان اور نظریۂ پاکستان سے انحراف کے القاب بڑی ارزانی سے تقسیم کئے جاتے ہیں، اور چند ماہ یا چند سال کے بعد انہیں بدل بھی دیا جاتا ہے۔ اب خواجہ صفدر صاحب غور فرمائیں کہ جس مسلم لیگ کے پنجاب زون کے وہ صدر ہیں آج وہ خان ولی خاں صاحب کو محبِ وطن قرار دیتی ہے اور ان کے ساتھ اور ان جیسے دوسرے حضرات کے ساتھ وہ قومی اتحاد میں اور اس کے باہر بغل گیر ہے اور میدانِ سیاست میں ان سے تعاون کر رہی ہے حالانکہ یہی مسلم لیگ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد اور سال دو سال پہلے تک انہیں وطن دشمن اور غدار ہی گردانتی تھی، کہئے تو گزشتہ ۲۸ سال کی مختلف اسمبلیوں کے ریکارڈ سے مسلم لیگی رہنماؤں کی جن میں آپ بھی شامل ہیں وہ تقاریر فراہم کر دی جائیں جن میں آپ نے سابق نیپ اور اس کے رہنما ولی خاں اور ان کے ساتھیوں کو کن کن القاب سے یاد نہیں کیا۔

ہمیں وہ دن بھی یاد ہے جب آپ ہی کی حکومت نے (۵۸ء سے پہلے) شیر بنگال مولوی فضل الحق کو غدار قرار دیا تھا بعد میں انہیں وزیر داخلہ بھی بنایا گیا ـــ اس لئے جب آپ یا کچھ اور مخصوص سیاسی مسلک کے حضرات پی ایف یو جے اور اس کے عہدہ داروں پر کمیونسٹ اور نظریہ پاکستان کے مخالف، ہونے کے الزامات لگاتے ہیں اور خود جج بن جاتے ہیں تو ہمیں اس سے مطلق پریشانی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان سے آپ کی کیا مراد ہے، اور حب الوطنی کا معیار آپ کے یہاں کیا ہے۔ اب کیا عرض کیا جائے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ آپ جس سیاسی محاذ میں شامل ہیں یعنی قومی اتحاد میں، اس میں کتنے ایسے افراد اور جماعتیں ہیں جنہوں نے پاکستان اور قائد اعظم کی مخالفت کی تھی اور اب وہ سب سے زیادہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کی حامی ہیں۔

اصل میں آپ کا اور آپ کے مسلک کے لوگوں کا اور سچ تو یہ ہے کہ قائد اعظم کی وفات کے بعد تقریباً ہر حکمراں جماعت کا المیہ یہ ہے کہ یہ صرف اپنے لئے صحافت اور اظہار کی آزادی اور بنیادی شہری حقوق چاہتے ہیں، اور اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو اس سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ملک میں جمہوریت فروغ نہیں پا سکی اور مارشل لا نافذ ہوتے رہے۔ افواج کو سیاست میں ملوث کیا جاتا رہا جس کے نتیجہ میں ہم اپنے ملک کے نصف حصّے سے محروم ہو گئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ سے اب بھی سبق حاصل نہیں کیا ہے۔ آپ لوگ اصولوں کی پاسداری کے بجائے آپ اشخاص یا جماعتوں کی پاسداری کرتے ہیں یا ان میں سے بعض کی مخالفت کرتے ہیں، پی ایف یو جے اور ایپنک کا یہ وطیرہ نہیں۔

مثلاً یہ کہ آپ صرف اس کا ذکر کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے دور میں آزادی صحافت اور آزادیٔ اظہار کا گلا کیونکر گھونٹا گیا۔ لوگوں کو شہری حقوق سے کیونکر محروم کیا گیا۔ حزبِ اختلاف کے ساتھ کیا ظلم اور زیادتی کی گئی، جسارت، حریت، مہران اور دوسرے اختلافی اخبارات و جرائد پر ڈی پی آر اور پریس اینڈ پبلیکیشنز جیسے رسوائے زمانہ کالے قانون کا استعمال کیسے کیا گیا مگر اسے فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ پی ایف یو جے نے بھٹو کے دور میں ان کالے قوانین کے وجود اور استعمال کے خلاف آواز اٹھائی اور حتی الوسیع جدوجہد کی اور اس سے پہلے کے ادوار میں بھی اس نے یہی اصولی موقف اختیار کیا اور آج جب آپ کی پسند کا مارشل لا نافذ ہے پی ایف یو جے آج بھی یہ بیڑا اٹھائے ہوئے ہے اور جدوجہد کر رہی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب پیپلز پارٹی کے دور میں زندگی، اردو ڈائجسٹ اور پنجاب پنچ بند کئے گئے اور ان کے ایڈیٹروں کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کیا گیا تو یہ پی ایف یو جے ہی تھی جس نے مالکوں اور ایڈیٹروں کی جماعت سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی، پھر اسی احتجاج کے نتیجہ میں ان ایڈیٹروں

آپ ریکارڈ درست کرلیں ہم نے آزادی صحافت کی جنگ ہر دور میں لڑی ہے

حفیظ راقب

کی رہائی ہوئی۔ اس کے بعد جولائی ۷۲ء میں روزنامہ سن بند کیا گیا تو پی ایف یو جے اور اخباری کارکنوں نے ۲۴ جولائی کو اس کی واگزاری کے لئے ملک گیر ہڑتال کی۔ پھر ۷۳ء میں جب جسارت، حریت، مہران پر پابندی لگی تو اس وقت بھی یہ پی ایف یو جے ہی تھی جس نے ۱۹ ستمبر کو ملک گیر ہڑتال کی۔ اس زمانے میں حکمران جماعت اور اس کے وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی پی ایف یو جے اور اس کے رہنماؤں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ نیپ اور جماعت اسلامی کے ایجنٹ ہیں۔ جسارت کے لئے ملک گیر ہڑتال کے لئے ہم نے کیسے تیاری کی، کیا کیا مخالفت اور دھمکیاں برداشت نہ کیں، اس کا کچھ ثبوت حاصل کرنا ہو تو دور نہ جائیے خود نوائے وقت کے مدیر محترم جناب مجید نظامی صاحب سے اور جنگ کے میر خلیل الرحمٰن صاحب سے دریافت کر لیجئے، جو اس وقت بالترتیب سی پی این ای اور پی این ایس کے صدر ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب اور مولانا کوثر نیازی نے اس وقت کے اٹارنی جنرل کی سربراہی میں جب ایک نام نہاد پریس کمیشن تشکیل دیا تو یہ پی ایف یو جے ہی تھی جس نے مسلسل اس کا بائیکاٹ کیا بلکہ اس کی ہدایت پر تنظیم کے ایک سابق صدر مسٹر اسرار احمد نے کمیشن کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور اسکی پاداش میں ان کا محکمہ اطلاعات کی جانب سے جاری کردہ ایکریڈیٹیشن کارڈ منسوخ کر دیا گیا۔ پی ایف یو جے آخر دم تک اس کمیشن میں شامل نہ ہوئی جب کہ اگست ۷۶ء میں مالکوں اور مدیروں کی جماعتوں نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ہم نے بھٹو دور میں متعدد بار یوم سیاہ منائے، کالی پٹیاں باندھیں اور جلوس نکالے۔

اور اگر آپ حضرات کو یاد ہو تو یہ بھی پی ایف یو جے اور اس وقت کی ایمپلائز یونینز کی سنٹرل ایکشن کمیٹی ہی کا جگر گردہ تھا کہ جب یو ڈی ایف کی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک پانچ روز سے زیادہ نہ چل سکی۔ ہم نے ۱۲ مئی ۷۴ء سے لے کر ۸ جولائی ۷۴ء تک مساوات لاہور کے اٹھارہ ملازمین کی بحالی کے لئے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے گرفتاریاں پیش کیں اس وقت پیپلز پارٹی حکومت کا پی ایف یو جے اور اس کے صدر منہاج برنا اور ان کے ساتھیوں پر یہ الزام تھا کہ وہ یو ڈی ایف کی جماعتوں کے اشارہ پر سول نافرمانی کی تحریک چلا رہے ہیں اور مساوات کے ۱۸ ملازمین کی بحالی

دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتاریاں عمل میں آئیں جیلوں میں محبوس کیا گیا اور پھر رہا کر دیا گیا اور بعد میں پی ایف یو جے اور مساوات کے منتخب نمائندوں سے گفتگو کی گئی لیکن اس دور میں البتہ بڑے بڑے صحافیوں کو قید بامشقت اور جرمانوں کی سزائیں دی جا رہی ہیں بلکہ کوڑے تک مارے گئے ہیں اور پھر بیسیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے اور بات چیت حکومت ایپنک اور پی ایف یو جے کے سرکردہ نمائندوں کی بجائے ایسے لوگوں سے کر رہی ہے جن سے خود ان کی ابتدائی یونینوں نے لاتعلقی کا اظہار کر دیا ہے۔

اب بھی اگر خواجہ صفدر صاحب اور ان کے ہمنواؤں کو پی ایف یو جے کی تحریک میں پیپلز پارٹی اور سیاست نظر آئے تو اس کا کیا علاج۔

پی ایف یو جے اور ایپنک کا موقف بہت سادہ سا ہے اور معمولی سوجھ بوجھ کا حامل انسان بھی اسے سمجھ سکتا ہے جو موقف یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اخبارات یا اخبا

آج مذاکرات کرنے والے کل تک بھٹو کی خوشامد کرتے تھے

محض ایک سیاسی چال ہے۔ آج خواجہ صفدر صاحب اور جسارت والے اور موجودہ عبوری (یا مستقل) حکومت پی ایف یو جے، ایپنک کی مساوات اور دیگر اخبارات کی بحالی اور اقتصادی مطالبات کی تحریک کو سیاسی قرار دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ آزادیٔ صحافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ ایک سیاسی چال ہے۔ دراصل ان الزامات میں جو بھٹو صاحب کے دور بالخصوص ۱۹۷۴ء میں پی ایف یو جے اور اس کے رہنماؤں پر لگائے گئے اور ان الزامات میں جو موجودہ حکومت اور اس کے ہمنوا ان دنوں پی ایف یو جے اور ایپنک پر عائد کر رہے ہیں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے اور پی ایف یو جے اور اخباری کارکنوں کی جانب دونوں حکومتوں کے طرز عمل میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، بجز اس بات کے کہ ۷۴ء میں

نویس غلطی نہیں کر سکتے، یا مسلمہ صحافتی ضوابط کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ پی ایف یو جے آزادی کے ساتھ ذمہ داری کی بھی قائل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بات کون طے کرے گا کہ کس اخبار کی کون سی خبر یا تحریر آزادی کی حدود سے نکل کر غیر ذمہ داری کی حدود میں داخل ہو گئی ہے، کس نے کس ضابطہ کی خلاف ورزی کی ہے، کون سی تحریر ملک و قوم کے مفادات کے خلاف اور تہذیب کے دائرے سے باہر ہے۔ پی ایف یو جے کا کہنا ہے کہ اس کا فیصلہ نہ کالے قوانین اور غیر معمولی عدالتوں کے ذریعے ہو سکتا ہے اور نہ انتظامیہ ہی کو جو کسی اخبار یا اخبار نویس کے خلاف کارروائی کرتی ہے خود ہی جج کے فرائض انجام دینے کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔ کالے اور غیر معمولی قوانین کا وجود اور صحافیوں اور اخبارات کے خلاف ان کا استعمال اگر کل قابل مذمت تھا تو آج بھی قابل مذمت ہے۔ البتہ کچھ لوگوں کے لئے یہ صرف کل قابلِ مذمت تھا اور آج نہیں ہے، کچھ لوگوں کے لئے کالے قوانین اور غیر معمولی عدالتوں کا استعمال صرف اسی وقت غلط اور غیر منصفانہ قرار پاتا ہے جب یہ ان کے خلاف استعمال ہوں، یا جب ان کی مخالف حکومت ان کا استعمال کرے، لیکن اگر یہ ان کی مخالف جماعتوں اور ان کے اخبارات کے خلاف استعمال ہو اور کارروائی کرنے والی حکومت اگر ان کی من پسند ہو تو پھر وہ انہیں جائز قرار دے دیتے ہیں۔ یہ کون سی اصول پسندی ہے۔ بھٹو حکومت نے جسارت کے خلاف بعینہ وہی الزامات عائد کئے تھے جو موجودہ حکومت اور خواجہ صفدر صاحب "مساوات" پر عائد کر رہے ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ قبلہ اگر یہ الزامات صحیح ہیں تو انہیں کسی عام عدالت میں ملک کے عام شہری قانون کے تحت مقدمہ چلا کر ثابت کر دیجئے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا، البتہ اخبارات کو کالے اور غیر معمولی قوانین کے تحت بند کرنا اور خاص طور سے اختلاف کرنے والے اخبارات کو بند کرنا اور ان کے مدیروں کو مارشل لاء ضوابط کے تحت گرفتار کرنا نہ منصفانہ عمل ہے اور نہ جمہوری۔ یہی موقف ہمارا اس وقت تھا جب جسارت اور دوسرے اخبارات کو پیپلز پارٹی حکومت نے بند کیا تھا، یہ موقف ہمارا اس وقت سے ہے جب سے پی ایف یو جے وجود میں آئی ہے۔

شاید آپ کو یاد نہ ہو اکتوبر ۵۳ء میں پی ایف یو جے نے اپنی مندوبین کے دوسرے سالانہ اجلاس میں جس کا افتتاح کراچی میں دستور ساز اسمبلی کے اسپیکر

مسلم لیگ نے انقلاب، نوائے وقت اور متعدد اخبارات بند کر دیتے تھے

مولوی تمیز الدین خان نے کیا تھا۔ سکیورٹی ایکٹ جیسے کالے قانون کے نفاذ کے خلاف ایک سخت قرارداد منظور کی تھی یہ کالا قانون مسلم لیگی حکومت ہی نے نافذ کیا تھا اور قائد اعظم کی معروف حکمت عملی سے انحراف کرتے ہوئے کیا تھا۔ قائد اعظم امتناعی نظربندی کے سیفٹی اور سکیورٹی ایکٹ جیسے کالے قوانین کے کٹر مخالف تھے، آپ کا شاید خیال ہے کہ آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ اظہار پر حملے صرف ایوب خاں اور بھٹو کے ادوار ہی میں ہوتے ہیں۔ جی نہیں مسلم لیگ حکومت کے دور میں کچھ کم نہیں ہوا۔ اگر آپ فرمائیں تو مشتے نمونہ از خروارے کچھ مثالیں پیش کر دی جائیں۔

آپ نے فرمایا ہے "بھٹو دور میں حاشیہ برداروں کے علاوہ کسی کو اخبار کا ڈیکلریشن نہ مل سکتا تھا البتہ بڑی تعداد میں ڈیکلریشن منسوخ ضرور ہوتے۔ اخبارات کے سروں پر پریس آرڈی ننس کی تلوار لٹکتی رہتی تھی اشتہارات بند کر کے اخبارات کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش لگاتار جاری رہتی۔ اخباری کاغذ پر بھٹو شاہی کی اجارہ داری نے صحافت کی آزادی کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔" آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا اور یہ تمام باتیں خود پی ایف یو جے اپنی متعدد قراردادوں اور جلسوں میں کہتی رہی ہے اور ان اقدامات کے خلاف مخلصانہ طور پر جدوجہد بھی کرتی رہی ہے۔

لیکن پی ایف یو جے اور اس وقت کی صحافیوں کی جماعتوں نے مسلم لیگ حکومت کے دور میں بھی یہ جدوجہد کی ہے اور اسی نوع کے اقدامات جن کو خواجہ صفدر صاحب نے صرف بھٹو دور سے منسوب کر دیا ہے خود مختلف مسلم لیگی حکومتوں کے دور میں بھی اخبارات اور صحافیوں کے خلاف اٹھائے جاتے رہے ہیں کیا خواجہ صاحب کو یاد ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں ممدوٹ حکومت کے دور میں جب روزنامہ "انقلاب" نے ان کی پالیسیوں سے اختلاف کیا تو صوبائی حکومت نے اس کا نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا۔ اس کے برعکس نوائے وقت کو جو ان کی حمایت کرتا تھا ایک عمدہ پریس الاٹ کیا گیا۔ انقلاب کچھ عرصہ تک بلیک سے کاغذ خرید کر کام چلاتا رہا لیکن کب تک، آخر اپنی موت مر گیا۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک معمولی سی تکنیکی غلطی کی وجہ سے اپریل ۵۱ء میں نوائے وقت کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا تھا اور اس کا الاٹ شدہ پریس سربمہر کر دیا گیا۔ اس کے بعد نوائے وقت کے مالکان نے "جہاد" جاری کیا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے دوسرے پریس پر جس میں جہاد شائع ہوتا تھا دباؤ ڈالا کہ وہ اس اخبار کی اشاعت سے انکار کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور روزنامہ جہاد بند ہو گیا۔ بڑی مشکل سے بعد میں نوائے وقت کا ڈیکلریشن بحال ہوا۔ یہ اخبار چونکہ اس دور میں جناب لیاقت علی خاں اور دولتانہ حکومت پر نکتہ چینی کرتا تھا اس لئے اسے یہ سزا دی گئی تھی، شاید آپ کو یاد ہو کہ مسلم لیگ حکومت ہی کے دور میں "چٹان" اور "ایشیا" ایک ایک سال کے لئے بند کر دیتے گئے تھے۔ دولتانہ صاحب اخبارات کو رشوت بھی دیا کرتے تھے، جس پر اس دور میں انہوں نے دو لاکھ روپے سے زائد خرچ کئے تھے، تفصیل یہ ہے کہ جون ۱۹۵۱ء میں ۴۲ ہزار روپے آفاق کو دیتے گئے اور ۸ ہزار روپے زمیندار کو۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ۱۸ ہزار روپے احسان کو، ۱۸ ہزار روپے آفاق کو، پانچ ہزار روپے زمیندار کو اور سات ہزار روپے مغربی پاکستان کو دیتے گئے۔ جون ۵۲ء میں ۱۷ ہزار روپے زمیندار کو، ۴۰ ہزار روپے آفاق کو، ۴۰ ہزار روپے احسان کو اور ۵ ہزار روپے مغربی پاکستان کو دیتے گئے۔ دسمبر ۵۲ء میں صرف مغربی پاکستان پر تین ہزار روپے خرچ کئے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں کراچی کے اخبار ایوننگ ٹائمز کے خلاف سیفٹی ایکٹ کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس کے ایڈیٹر مسٹر زیڈ۔ اے سلہری کو (جو آج کل مارشل لا حکومت کے ایڈیشنل سکریٹری اطلاعات ہیں) اور نائب مدیر خورشید عالم کو گرفتار کیا گیا۔

پی ایف یو جے نے اپنی ۵۳ء کے اجلاس کی قرارداد میں ان من مانے اقدامات پر شدید نکتہ چینی کی قرارداد میں حکومت سے کہا گیا تھا: "متعدد اخبارات کو ڈیکلریشن دینے سے انکار کیا گیا ہے، جن کے پاس ڈیکلریشن تھے انہیں منسوخ کیا گیا ہے بہت سی مطبوعات پر من مانے طور پر پابندی لگائی گئی۔ چھوٹے اخبارات کا گلا گھونٹنے کے لئے ان سے زر ضمانت کی شکل میں بھاری رقوم طلب کی گئی ہیں۔ صحافیوں کو پولیس اور سی آئی ڈی کے ذریعہ ہراساں کیا گیا ہے اور انہیں مقدمہ چلائے بغیر نظربند کیا گیا ہے۔ ایڈیٹر، پبلشر یہاں تک کہ کارٹونسٹ بھی گرفتار کئے گئے۔ انہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کیا گیا۔ اشتہارات کو بطور رشوت استعمال کرنے کے لئے اخبارات و جرائد کی سیاہ فہرست تیار کی گئی۔ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کو مملکت پر نکتہ چینی کے مترادف قرار دیا گیا۔"

غور کیا آپ نے کہ پی ایف یو جے نے یہ قرارداد اکتوبر ۱۹۵۳ء میں منظور کی تھی۔ اس لئے یہ امر واضح ہے کہ پی ایف یو جے گذشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصے سے آزادیٔ صحافت کے لئے اصولی بنیادوں پر جدوجہد کر رہی ہے اور اس معاملے میں اس نے کبھی اس سے دلچسپی نہیں رکھی کہ کون سی حکومت اور کس پارٹی کی حکومت برسر اقتدار ہے۔

خواجہ صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ پی ایف یو جے اور ایمنک نے ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء کو سارے ملک میں آزادیٔ صحافت کے لئے یوم مطالبات منایا تھا اور دفعہ ۱۴۴ کی موجودگی کے باوجود جلسے منعقد کئے تھے اور جلوس نکالے تھے۔ کراچی میں اس جلوس کی قیادت صدر پی ایف یو جے اور ان کے وہی ساتھی کر رہے تھے جنہیں آج آپ پیپلز پارٹی کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں۔ اس روز جلوس کے شرکا کو پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں نے ہار پہنائے تھے اور ان پر پھول نچھاور کئے تھے۔ یہ مارچ کی تحریک سے دو ڈھائی ہفتے پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں حکمراں طبقے پی ایف یو جے کے رہنماؤں کو پی این اے کا ایجنٹ قرار دیتے

مسلم لیگ کے دور حکومت میں اخبارات کو بھاری رشوتیں دی گئیں

پی ایف یو جے گزشتہ ربع صدی سے اصولوں پر جدوجہد کر رہی ہے

تھے اور کراچی پریس کلب کو پی این اے کا گڑھ گردانتے تھے اور جناب منہاج برنا کو صحافیوں میں پی این اے کے ہم خیال عناصر کا سرغنہ بتاتے تھے۔ اس زمانے میں صدر پی ایف یو جے نے اپنی ذاتی حیثیت میں حالات حاضرہ کے بارے میں "پرانی سیاست گری خوار ہے" کے سلسلے سے جو مضامین لکھے تھے وہ قومی اتحاد کے رہنماؤں میں بڑے مقبول تھے اور وہ جیلوں میں بیٹھ کر انہیں پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ ان مضامین میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی پالیسیوں پر شدید تنقید ہوتی تھی لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ آج ان میں کچھ حضرات محض اس بنا پر اینپیک اور پی ایف یو جے کی تحریک کو سیاسی تحریک قرار دے رہے ہیں کہ یہ مساوات لاہور اور کراچی، اور الفتح اور معیار کی بحالی ، اور اخباری کارکنوں کے جائز اقتصادی مطالبات کے لئے ہے.

آج موجودہ حکومت نے ایسے نام نہاد صحافیوں پر مشتمل پی یو جے کی مذاکراتی ٹیم ترتیب دی ہے جو بھٹو حکومت سے فوائد حاصل کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہ رشید صدیقی صاحب جب ۷۸ء میں مساوات لاہور کے کارکنوں کی بحالی کے لئے گرفتاریاں دینے کی تحریک چل رہی تھی، تو نہ صرف یہ موصوف اس تحریک میں شامل نہیں ہوئے بلکہ اس کی مخالفت کی۔ پھر انہوں نے اپنے اسلام پسند "صحافی لیڈر" جناب ضیاء الاسلام انصاری اور مساوات کے ایڈیٹر عباس اطہر سے مل کر مسٹر بھٹو کو لاہور پریس کلب میں مدعو کیا اور ان سے آٹھ لاکھ روپے کا عطیہ وصول کیا اور اس کے عوض لاہور پریس کلب کا نام ذوالفقار علی بھٹو پریس سنٹر رکھنے کا وعدہ کیا اس کے برعکس سابق وزیراعظم اور ان کے دوسرے وزرا کا داخلہ کراچی پریس کلب میں بند تھا. سابق وزیراعظم نے کراچی پریس کلب کو ایک روپے کا عطیہ نہیں دیا. آج وہی لوگ جو پیپلز پارٹی حکومت کی حاشیہ برداری کرتے تھے، پی ایف یو جے اور اس کے رہنماؤں پر سیاسی مفادات کے حصول کا الزام لگاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ساری تحریک محض پیپلز پارٹی کے لئے چل رہی ہے. محض اس لئے کہ مسئلہ مساوات کی بحالی کا ہے.

رہ گئی یہ بات کہ جسارت کے لئے بھوک ہڑتال کیوں نہ کی گئی صرف ملک گیر ہڑتال پر اکتفا کیوں کیا گیا۔ تو بھائی جدوجہد کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جو جس وقت موثر اور کارگر ہو اُسے استعمال کیا جاتا ہے دوسرے سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ متاثرہ اخبار کے کارکن خود کس حد تک جدوجہد کرنے کو تیار ہیں. اگر جسارت کے کارکنوں کو پی ایف یو جے کے نام سے بخار چڑھتا تھا، اور وہ بھوک ہڑتال وغیرہ کو "غیر اسلامی اور غیر قانونی" سمجھتے تھے، تو اس کا کیا علاج. مدعی سست ہو تو گواہ کی چستی سے فائدہ ؟

آخر میں ہم حکام اور ان کے حامی سیاسی عناصر سے یہ کہیں گے کہ بھائی صاحب پی ایف یو جے کا تو کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے. البتہ آپ کے سیاسی مقاصد ضرور ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے تمام اخبارات بند رہیں یا جو باقی ہیں سو وہ کر دیئے جائیں جو آپ کے سیاسی مسلک کے حامی نہیں بسیاست آپ کر رہے ہیں پی ایف یو جے نہیں. لیکن اسی خود فریبی میں کب تک مبتلا رہیے گا. اب بھی وقت ہے کہ حکام دانش مندی سے کام لیں اور پی ایف یو جے اور اینپیک کے منتخب سرکردہ رہنماؤں سے گفتگو کر کے مسئلہ کو آزادی صحافت کے اصولوں کی بنیاد پر طے کریں. پی ایف یو جے اور اینپیک کے "رفیق باجووں" سے کام نہیں چلے گا.

بقیہ : جشنِ مجنوں

استفادہ کرنے کے چلن کا آغاز ہوا، تو انہوں نے "ادب اور زندگی" کے عنوان سے ایک عدد مضمون لکھا. تنقید کا نیا طرز تھا لہٰذا انہیں ویسی ہی شہرت ملی جیسی ظفر عمر نے کانن ڈائل کے ناول کے ترجمہ کو اردو میں "نیلی چھتری" کے عنوان سے طبعزاد تصنیف بنا کر کمائی. ان ہی دنوں مجنوں نے مثنوی زہر عشق کے طرز پر "سمن پوش" کے عنوان سے ایک طویل کہانی لکھی. آدمی تیز ہیں. ایک خبر بھی گھڑ کر اخبارات میں شائع کرا دی کہ "سمن پوش" پڑھ کر ایک نوجوان نے خودکشی کر لی. اس سنسنی خیزی سے پبلسٹی ملی. مجنوں ادب کے جنرل مرچنٹ ہیں. تنقید لکھتے ہیں. افسانے لکھتے ہیں اور شاعری بھی فرماتے ہیں.

پاکستان بنا تو احسان رشید، حکیم سکلے اور اسی قبیل کے بہت سے دردمند تھے جہاں جردالدین کی طرح مجنوں نے بھی اپنے تمام لڑکوں کو پاکستان بھیج دیا. کسی نے متروکہ جائیداد الاٹ کرالی، کسی نے وائس چانسلری حاصل کی اور مجنوں کے بیٹوں نے عہدے اور منصب سنبھالے. مجنوں خود بھارت میں رہے. اور اکھنڈ بھارت اور ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپتے رہے. کانگریس کو خوش کر کے ترقی کرتے رہے. ریٹائر ہوتے تو پاکستان کا رُخ کیا. پاکستان پہنچتے ہی وہ دو قومی نظریے پر ایمان لے آئے. اب یونیورسٹی سے ہزار روپیہ وظیفہ کے طور پر تنخواہ لیتے ہیں. بڑے بیٹے کی عالی شان کوٹھی میں رہتے ہیں. جوش کی دست گیری کے لئے کوثر نیازی مل گئے. نیازی کو بھی حکیم سکلے کی طرح دانشوری کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی عارضہ ہے. اسی طرح جوش دلی عہد حیدر آباد دکن، معظم جان کی حاضر باشی سے نکلے تو کوثر نیازی کے حلقہ بگوش ہوئے.

مجنوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہیں کوئی ایسا نظر شناس نہ ملا جو کوثر نیازی کی طرح سیاسی بازی گر ہوتا. البتہ ایسے ادبی مردہ شو اور مجاور مل گئے جن کا کام تدفین سے پہلے مردوں کو غسل دینا اور کفنانا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد ان کے سالانہ عرس کر کے اپنا پیٹ پالنا ہوتا ہے. کچھ ادیب ہوتے ہیں. کچھ ادب فروش ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب فروش بھی ہوتے ہیں. ادیب فروشوں کو اس سے غرض نہیں کہ ادیب پر معاشرے کی جانب سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور آزادی اظہار کی ہر جنگ اسی کی جنگ ہوتی ہے. مگر جب ادب خیرات اور زرگری کا ذریعہ بن جائے تو ادیب، ادیب نہیں رہتا. اندھا اور بہرا بن جاتا ہے. نیرو بن جاتا ہے. روم جلتا ہے تو وہ چین کی بنسری بجاتا ہے. صحافیوں پر کوڑے برسائے جاتے ہیں. طلبہ پر فائرنگ ہوتی ہے اور چادر اور چہار دیواری کا تقدس پامال ہوتا ہے تو وہ حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے احتجاج کرنے سے کتراتا ہے. اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے. خود کو نیلام کی بولی پر چڑھاتا ہے نہایت ڈھٹائی سے "جشن مجنوں" منا کر شادیانے بجاتا ہے اور اہل قلم اور اہل دانش کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتا ہے. "جشن مجنوں" پر مجنوں گورکھپوری ہی کا ایک شعر صادق آتا ہے۔

جگنو اڑ، اُڑ کے چلے جاتے ہیں صحرا کی طرف
گورِ مجنوں پہ کہیں آج چراغاں ہوگا

ملتان — **قسور سعید مرزا**

چلو، پیپلز پارٹی میں خود بخود تطہیر ہو گئی

"دیدہ ور" کے مصنف اور پیپلز پارٹی سے نکلے ہوئے مولانا کوثر نیازی نے سیاسی وسماجی حلقوں کی توقعات کے مطابق اپنا اصل رُخ دکھا ہی دیا۔ ستمبر ۷۷ء سے مارچ ۷۸ء تک مولانا زکام، بخار اور پھوڑے نکل آنے کی بیماریوں میں مبتلا رہے اور شاید اب بالکل صحت مند ہو چکے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو اور کارکنوں کو تخریب پسند قرار دینے کے بعد اب پاکستان پیپلز پارٹی کے قائم مقام چیئرمین بن گئے ہیں اور گذشتہ ہفتے ۲۵ افراد پر مشتمل ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے الیکشن سیل سے ملاقات بھی کر چکے ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ چائے پینے کے بعد انہوں نے قائم مقام چیئرمین بننے کا اعلان کیا۔

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہو یا آزادی، پاکستان کے عوام کا شعور اس حد تک آگے جا چکا ہے کہ سیاستدان بے بس نظر آتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو گذشتہ چھ سالوں میں نہ تو شہری اور نہ ہی ضلعی سطح پر فعال اور اور عوامی قیادت نصیب ہوئی ہے اور نہ ہی پارٹی کے با اقتدار ہونے کے بعد ہائی کمان نے فعال قیادت دینے کی کوشش کی۔ بالخصوص پنجاب میں کارکنوں نے تنظیم کو فعال بنانے کے لئے متواتر آوازیں بلند کیں لیکن زیرِ عتاب رہے اور اب وہی کارکن جو صادق حسین قریشی سے لے کر آغا افضل کے دور تک مصیبتوں کا شکار رہے پارٹی کا بہترین سرمایہ ثابت ہو رہے ہیں۔ ملتان ضلع میں مولانا کوثر نیازی کو مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ کسی زمانے میں ملتان کی سیاست قریشیوں اور گیلانیوں کے گھر کی لونڈی تھی۔ یہ لوگ سفید اور سیاہ کے مالک تصور ہوتے تھے۔ سرکاری ملازمین کے تبادلے اور تقرریاں ان کے ایک اشارے سے ہو جاتے تھے لیکن آج صورتحال بالکل مختلف ہے۔ مخدوم حامد رضا گیلانی سابقہ دورِ حکومت میں سفیر اور وفاقی وزیر رہے ہیں۔ قومی اتحاد کی جانب سے چلائی جانے والی تحریک کے دوران حامد رضا اپنے والد مرحوم کے مقبرہ پر نہیں جا سکے۔ کیونکہ ان کے والدِ مرحوم کا مقبرہ اندرونِ شہر واقع ہے جہاں آبادی کی اکثریت مولانا حامد علی خان کے ساتھ تھی۔ یہ حامد رضا کی ذاتی مقبولیت کا عالم تھا۔ ۵ جولائی کی کارروائی کے بعد آہستہ آہستہ مخدوم صاحب گوشۂ گمنامی میں چلے گئے اور اپنے مخصوص سیاسی طریقۂ واردات کو جاری رکھا۔ مولانا کوثر نیازی کی نسبت اسلام آباد سے اچھے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ ماضی کے آئینے میں مستقبل بنا رہے ہیں اقتدار سے وفاداری کی صلاحیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ عوامی سیاست ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ صادق حسین قریشی ویسے ہی سیاست سے تھک چکے ہیں اور اب ریٹائر ہونا چاہتے ہیں۔ پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کو کمزور اور تباہ کرنے میں موصوف نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ ان سے زیادہ با اختیار شاید ان کا پرائیویٹ سیکرٹری نبی بخش بھٹی تھا۔

قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان کا تعلق بھی ملتان سے ہے۔ آج کل انہوں نے اپنی وکالت دوبارہ شروع کر دی ہے۔ کبھی کبھی سیاسی افکار پر اظہارِ خیال فرما دیتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی سے ٹیلی فون پر اکثر رازدارانہ گفتگو کرتے رہتے ہیں کیونکہ ۶ سال اسمبلی میں اکٹھے وقت گذارا ہے۔ باخبر ذرائع کے مطابق صاحبزادہ فاروق علی خان کھل کر مولانا کی حمایت کرنے سے قاصر ہیں۔

مولانا کوثر نیازی کو ملتان ضلع میں اپنے قریبی اور جگری دوست رانا تاج احمد نون سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ رانا تاج احمد نون بھی نہایت خاموشی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ اگر انہوں نے کوئی غلط فیصلہ کیا تو ذاتی ملازم بھی شاید اُن کا ساتھ چھوڑ جائیں۔ دوسری طرف قومی اسمبلی کے سابق رکن سید عباس حسین گردیزی، احمد بخش تھہیم، نذر سجاد قریشی، ملک الطاف علی کھوکھر، ظفر علی تھہیم ایڈووکیٹ، خالد محمود بخاری اور محمد اسلم نون نے بُرے دنوں میں بھٹو خاندان کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے اور اب تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ ضلع ملتان میں جو لوگ جا چکے ہیں ان کے جانے پر پارٹی کارکن اور عام آدمی بہت خوش ہے کہ چلو بھٹو صاحب نے تو تطہیر نہیں کی اب پی این اے اور عبوری حکومت کی کوششوں سے ہی پارٹی میں تطہیر ہو گئی ہے کارکن تو چاہتے ہیں کہ بقایا موقع پرست بھی ان کی جان چھوڑیں تو بہتر ہے بہر حال اقتدار پسندوں کی رخصتی سے پاکستان پیپلز پارٹی پہلے کی نسبت مضبوط اور فعال ہو گی۔

طلبا

تعلیمی اداروں میں غنڈوں کا راج اور حکومت کی ہمنوائی ـــ!

ملتان کے مختلف کالجوں کی منتخب اسٹوڈنٹس یونینوں نے گذشتہ ہفتے ایک مقامی ہوٹل میں پریس کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں اسلامی جمعیت طلبا کے کارکنوں کی غنڈہ گردی کا سدِ باب کر کے طلبا کو پُر امن ماحول فراہم کیا جائے پریس کانفرنس میں نشتر میڈیکل کالج یونین کے صدر ہارون رفیع السلام جنرل سیکرٹری شاہد رانا، گورنمنٹ اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج یونین کے صدر سعدی خان، گورنمنٹ ملت کالج یونین کے صدر سرور ڈوگر، گورنمنٹ ڈگری کالج سول لائنز کے صدر عاصم صدیقی، گورنمنٹ کالج بوسن روڈ کے نائب صدر امین سکھیرا، پاک نیدرلینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نشتر کالج کے صدر شیخ محمد نسیم اور ممتاز طالب علم رہنما میاں رشید کے علاوہ مختلف طلبہ یونینوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ان طالب علم رہنماؤں نے پریس کانفرنس میں کہا کہ ہم ایک عرصہ سے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک مخصوص سیاسی جماعت اپنی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے ذریعے تعلیمی اداروں میں تشدد، مار پیٹ، اور بدامنی پھیلانے میں مصروف ہے اور اب کچھ عرصے سے انہوں نے اپنے لئے حکومت کا نام استعمال کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اور ہر جگہ عبوری حکومت کو اپنا

ہمنوا ظاہر کر کے غنڈہ گردی کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ بچانے کے لئے ان کے پاس اب یہ واحد حربہ رہ گیا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے چند بیرونی غنڈوں کو ساتھ ملا کر "لبرلز" کے طالب علم رہنما اعجاز بشیر پر قاتلانہ حملہ کیا۔ انہیں چاقوؤں اور خنجروں سے زخمی کرنے کے بعد بڑی ڈھٹائی سے یہ جھوٹ بولنا شروع کر دیا کہ اعجاز بشیر کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے۔ اور وہ کئی تھانوں میں پولیس کو مطلوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل بعض لوگوں کو ہر مسئلہ میں پیپلز پارٹی چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ خواہ یہ مسئلہ کالونی ملز اسماعیل آباد کا ہو، صحافیوں کا ہو یا طلباء کا۔ "لبرلز" نشتر میڈیکل کالج ملتان کی ایک ایسی تنظیم ہے جس کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کا منشور ہی یہ ہے کہ "تعلیمی اداروں میں سیاسی جماعتوں کی مداخلت ختم کرائی جائے اور سیاسی جماعتوں کو کوئی موقع نہ دیا جائے کہ وہ طلباء کو استعمال کر سکیں"۔

ان طلباء نے کہا کہ ہم اس پروپیگنڈہ کی پرزور مذمت کرتے ہیں کہ "لبرلز" کا کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق ہے اور اگر کوئی صاحب اعجاز بشیر پر کسی بھی جگہ کوئی مقدمہ ثابت کر دیں تو ہم غنڈہ گردی کرنے والوں کے خلاف اس مقدمہ کی پیروی سے دستبردار ہو جائیں گے۔ چند روز قبل گورنمنٹ کالج سول لائنز میں اسلامی جمعیت طلبہ کے بیرونی غنڈوں نے ایک طالب علم کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا ہم سمجھتے ہیں کہ اگر سول لائنز کالج کے واقعہ کا خاطر خواہ نوٹس لیا جاتا تو پھر نشتر کالج میں اس کا اعادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم حکام کو آگاہ کرتے ہیں کہ نشتر کالج اور سول لائنز کالج میں غنڈہ گردی کے واقعات پر انتہائی سخت اقدامات کی ضرورت ہے۔ اگر اب یہ نہ کیا گیا تو تعلیمی اداروں میں بیرونی غنڈوں کی آمد و رفت بڑھ جائے گی۔ اور طلبہ کے اشتعال میں اضافہ ہو گا۔ جس کے نتیجہ میں امن و امان کی بدتر صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اگر چند روز میں غنڈہ عناصر کے خلاف کارروائی نہ ہوئی تو ملتان کے تمام کالجوں کے طلبہ بھرپور احتجاج کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایف سی کالج کے امین اللہ کے قتل میں اسلامی جمعیت طلبہ کے صوبائی ناظم اور دوسرے عہدہ دار ملوث ہیں اس میں کسی سے رعایت نہ برتی جائے اور قاتلوں کو پھانسی دی جائے۔

●●

ملتان میں اخباری کارکنوں کی حمایت میں بھوک ہڑتال

ملک امیر محمد خان

گزشتہ دنوں چوک شاہ عباس میں محنت کشوں کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں ایپنک اور پی ایف یو جے کی جدوجہد کو سراہا گیا۔ ورکرز رابطہ کمیٹی ملتان کے آرگنائزر مقبول انیس ایڈووکیٹ نے آزادی صحافت کے حق میں آواز بلند کرنے پر قید اور کوڑوں کی سزا کو وحشت و بربریت کا ایک اور شاہکار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ محنت کش برادری کو صحافیوں سے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ جناب مقبول انیس نے ایپنک، اور پی ایف یو جے کے سربراہ جناب منہاج برنا سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں جس کے تحت انہوں نے مزدوروں اور طلبہ کو اس منصفانہ تحریک میں شمولیت سے روک رکھا ہے جو کہ ہر باشعور اور باضمیر شہری کے دل کی آواز ہے۔

ملتان کے وکلاء اور طالب علم پہلے ہی ایپنک اور پی ایف یو جے کی اس تاریخی جدوجہد کی بھرپور حمایت کا اعلان کر چکے ہیں۔ عملی جدوجہد میں حصہ لینے والے جیالوں کی ایک بڑی فہرست ایپنک اور پی ایف یو جے کی مشترکہ ایکشن کمیٹی کو روانہ کی جا چکی ہے۔ اس ضمن میں ایکشن کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

عام آدمی کو اس بات پر سخت تشویش ہے کہ صحافیوں کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔ اس طرح عدم اطمینان اور عدم تحفظ کا احساس مزید بڑھ رہا ہے۔ رائے عامہ واضح طور پر کوڑوں کی سزا کے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ جب صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے تو رجعت پسند سیاسی جماعتوں کو بھی اپنی مجرمانہ خاموشی کو توڑنا پڑا۔ بعض عناصر کی طرف سے یہ کہہ کر رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی کوشش قطعی ناکام ہو گئی ہے کہ ملک بھر کے صحافی اور اخباری کارکن صرف روزنامہ مساوات کی بحالی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ تحریک سیاسی مقاصد کے لیے ہے۔ یہ تاثر قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ آزادی صحافت کا تعلق کسی ایک مخصوص جماعت سے نہیں بلکہ اس کا تعلق براہ راست ملک کے عوام سے ہے۔ آزادی صحافت عوام کا حق ہے جسے حکومت یا سیاسی جماعتوں کی ملی بھگت غصب نہیں کر سکتی۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے اور اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ صحافی ہر دور میں آزادی صحافت کے لیے سربکف رہے ہیں۔ آج بھی ان کے سامنے یہی چیلنج درپیش ہے اور وہ آج بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

وادی سندھ کے ایک خوبصورت شہر حیدرآباد کے بعد اب ملتان میں بھی صحافیوں کی حمایت میں عوام کی سطح پر بھی بھوک ہڑتال اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ملتان کے عوام جنہوں نے ہر دور میں جمہوری اقدار کو آگے بڑھانے میں پیش قدمی کی ہے۔ اب بھی جمہوری اصولوں کی بالادستی اور آزادئ صحافت کی اصولی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں ملتان کے محنت کشوں، طالبعلموں، دانشوروں اور کسانوں کی طرف سے پی ایف یو جے کے ۸ نکاتی مطالبات کی بھرپور حمایت کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں پروگریسو فرنٹ ملتان نے عملی جدوجہد کا اعلان کیا۔ ۷ مئی کو فرنٹ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر احسن فارقلیط نے آزادی صحافت زندہ باد کے پرجوش نعروں کی گونج میں اسیر صحافیوں کی رہائی، روزنامہ مساوات لاہور اور کراچی ایڈیشنوں کی بحالی، دیگر متعدد اخبارات کو بدنام زمانہ پولیس پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کے تحت ضمانت طلبی کے نوٹسوں کی واپسی کے لیے تادم مرگ بھوک ہڑتال شروع کی۔ ملتان کی معروف کاروباری مرکز چوک حسین آگاہی پر لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے جناب احسن فارقلیط کا خیر مقدم کیا۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور آزادی صحافت کے نصب العین کو سربلند رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا۔ کچھ دیر بعد مقامی انتظامیہ حرکت میں آئی اور پولیس کے ایک دستے نے جناب احسن فارقلیط کو خودکشی کرنے کی کوشش اور متعدد مارشل لاء ضوابط کی

خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اپنی گرفتاری سے قبل جناب فارقلیط نے لوگوں کو بتایا کہ پولیس نے ان کے ایک ساتھی اور فرنٹ کے جنرل سیکرٹری جناب منظر جعفری کو ۱۶ رمئی کو اغوا کر لیا ہے۔ جنہیں پروگرام کے مطابق جناب فارقلیط کی گرفتاری کی صورت میں ۱۹ رمئی کو بھوک ہڑتال شروع کرنی تھی۔ تاہم اس وقت پولیس کے ذریعوں نے منظر جعفری کو گرفتار یا اغوا کرنے کی تردید کی بعد میں ۱۸ رمئی کو دو دن کی گمشدگی کے بعد منظر جعفری نے عوام کو صورتحال سے باخبر کیا کہ انہیں ۱۶ رمئی کی شام کو سادہ لباس والے زبردستی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور دور دراز کے علاقے میں لے جاکر چھوڑ دیا۔ ۱۹ رمئی کی صبح کو جناب منظر جعفری نے بھی چوک حسین آگاہی میں بھوک ہڑتال شروع کی اور حق و صداقت کی حمایت میں آواز بلند کرنے کی پاداش میں پابند سلاسل ہو گئے۔ پروگریسو فرنٹ ملتان کے عہدیدار اور کارکنان ایک دن کے وقفہ کے ساتھ صحافیوں کی حمایت میں بھوک ہڑتال اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ •

منڈی بہاؤالدین

میاں محمد شریف زاہد

جمہوریت کے دعویٰ دار خواتین کے جمہوری حقوق تسلیم کیوں نہیں کرتے: کلثوم جمال

گذشتہ دنوں انجمن جمہوریت پسند خواتین کی سکریٹری جنرل کلثوم جمال یہاں تشریف لائیں اور دو روز تک یہاں قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے شاہ تاج شوگر ملز میں پنجاب بھر کی شوگر ملوں کی سی بی اے یونینوں کے کنونشن میں شرکت کی اور خطاب بھی کیا۔ کنونشن سے قبل شوگر ملز ایمپلائز فیڈریشن پنجاب کے صدر مسٹر شوکت حسین نیازی کی رہائش گاہ پر میری ان سے اچانک ملاقات ہو گئی اس دوران جو بات چیت ہوئی وہ پیش خدمت ہے۔

س: آپ کی انجمن کا کسی سیاسی جماعت سے رابطہ یا تعلق ہے؟ آپ کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

ج: ہماری انجمن کا کسی بھی سیاسی جماعت سے رابطہ یا تعلق بالکل نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف اور صرف پڑھی لکھی خواتین سے رابطہ پیدا کر کے اپنے قافلہ میں شریک کرنا اور پھر ظلم کے خلاف متحد ہو کر جد و جہد کو تیز کر کے ایک خوشحال و امن اور آزادی کا معاشرہ قائم کرنا اور ان پڑھ عورتوں کو اپنا مقصد بتا کر ساتھ ملانا ہے۔ اس وقت ہمارے فرسودہ معاشرہ میں عورت کو ایک غلام کی حیثیت حاصل ہے اور اسے چادر اور چہار دیواری کے نام پر غلام در غلام بنایا جاتا ہے اسے آزادی کے مفہوم تک کا علم نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت تعلیم حاصل کرتی ہے یا کرنا چاہے تو اسے گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کے مہذب ٹھیکیدار عورت کو جہالت کی تاریکی میں رکھنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں اور علم کی روشنی سے دور رکھنے کے لئے کئی قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ معاشرے میں خرابیوں کے ذمہ دار کون ہیں؟ اس وقت تقریباً نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے لیکن انہیں انسانیت کے نام پر بھی آزادی نہیں دی جاتی۔ ہمارے ہاں ٹھیکیداروں نے آزادی کا مفہوم غلط رنگ میں پیش کیا ہے لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح مرد بے خوف و خطر آزادی سے معاشرہ میں زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح عورت کو

بھی زندگی بسر کرنے کا حق دیا جائے۔ اگر وہ بنی آدم کی بیٹی اور [illegible] ی معمار ہے تو اسے حکومت کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا۔ اگر یہ مہذب ہوتے اور جمہوریت پسند کہلانے کے دعویدار ہیں تو عورت کو جمہوری طریقے سے آگے بڑھنے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ ان معاشی سیاسی۔ اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے ہی ہماری تمام تر جد و جہد ہے۔

س: جب آپ اس موجودہ معاشرہ میں مردوں کے جلسوں سے خطاب کرتی ہیں تو آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟

ج: میرا تعلق ایک محنت کش گھرانے سے ہے ظاہر ہے کہ میں محنت کشوں میں ہی جاؤں گی۔ جب میں مزدوروں، کسانوں میں جاتی ہوں تو یہی محسوس کرتی ہوں کہ میں اپنے بھائیوں اور بزرگوں میں موجود ہوں۔ بھائی اور بزرگ ہمیشہ اپنی بہنوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ہمہ تن تیار ہوتے ہیں۔ میں محنت کشوں کو محنت کش خواتین کی انقلابی جد و جہد کے بارے میں بتاتی ہوں اور وہ اپنی بہنوں اور ماؤں کی جد و جہد سن کر خوش ہوتے ہیں۔

س: موجودہ معاشرے میں خواتین کا استحصال کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟

ج: اس وقت ہمارا پورا معاشرہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اس میں ہمارے ملک کے مزدوروں کسانوں اور محنت کشوں کا بھی استحصال ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اگر محنت کش مردوں کا استحصال ہو گا تو محنت کش خواتین پہلے ہی غلام ہیں لہٰذا اس کا ایک ہی حل ہے، مرد اور خواتین مشترکہ جد و جہد کر کے اس معاشرتی ڈھانچہ کو تبدیل کریں تاکہ یہاں ایک غیر طبقاتی معاشرے کو جنم دے کر ظلم، ناانصافی، مہنگائی، بے روزگاری، جہالت اور دوسری سماجی برائیوں کو ختم کیا جا سکے۔ انہوں نے ملک بھر کی محنت کش خواتین سے اپیل کی کہ وہ اپنی شعوری سطح کو بلند کریں، شہروں اور دیہاتوں میں پھیل کر خواتین کو ان کے حقوق و مفادات سے آگاہ کر کے بیدار کریں انہوں نے کہا کہ جب تک یہ سماج نہیں بدلے گا ہماری جنگ جاری رہے گی اور انشاءاللہ آخری فتح ہماری ہو گی اور وہ دن دور نہیں جب یہاں سویرا ہو گا اور یہاں کا بچہ بچہ خوشحالی اور آزادی کی زندگی بسر کر کے ملکی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا اور ہم پاکستان کو عظیم تر مملکت بنا کر دنیا سے اپنی طاقت کا لوہا منوائیں گے۔

قبائلی عوام کی پسماندگی کا ذمہ دار

غیر منصفانہ پولیٹیکل نظام

شاکراللہ خان آفریدی

صوبہ سرحد سے ملحق قبائلی علاقوں کے کم و بیش ستر لاکھ قبائلی عوام اس جدید اور خلائی دور میں بھی بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ ان پر ابھی تک جارحانہ اور غیر منصفانہ پولٹیکل نظام مسلط ہے جو انگریزوں نے ان کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق کچلنے کے لئے رائج کیا تھا۔

قبائل نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی تاریخی جدوجہد میں بیش بہا قربانیاں دی تھیں۔ لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی قربانیاں فراموش کر دی گئیں۔ اور ان کو حقیقی آزادی، بنیادی حقوق، ان کی اقتصادی ترقی اور روزگار فراہم کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جس کے نتیجے میں قبائلی جدید اور ترقی یافتہ دور کے ثمرات سے یکسر محروم ہیں۔ قبائل کی نمائندگی کا جو طریقہ رائج ہے وہ انتہائی فرسودہ اور ناکارہ ہے۔ نمائندگی کے دعویدار کسی طرح بھی قبائلی عوام کے حقیقی نمائندے نہیں ہیں کیونکہ ان کا انتخاب بالغ رائے دہی کے عالمی اصولوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ للہذا بہتر ہوگا کہ اس طریقہ کار کو فی الفور ختم کیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا خود قبائلی عوام کا حق ہے کہ وہ اپنے ہاں کون سی طرز زندگی پسند کرتے ہیں۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب نمائندے ہی اسمبلی میں اپنی قومی خواہشات اور روایات کے مطابق اپنی آزادی اور سلامتی کا تحفظ بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں

پولٹیکل نظام اور غلط طریقہ انتخاب نے قبائل کی زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ روزمرہ اور نت نئے اقتصادی مسائل، بیروزگاری اور ناخواندگی کی وجہ سے وہ اجتماعی طور پر انتہائی پسماندہ ہیں۔ قبائلی علاقے مختلف قومی مسائل اور مشکلات سے دوچار ہیں۔ یہاں تک مختلف قبائلی علاقوں میں پینے کا پانی تک نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے ترقیاتی فنڈ کے لئے کروڑوں روپے دیئے جاتے ہیں لیکن بدترین نظام کی بدولت قبائل کو ترقیاتی اسکیموں میں شریک کرنا تو کجا ان سے صلاح و مشورہ تک نہیں کیا جاتا بند کمروں میں ترقیاتی اسکیمیں منظور ہوتی ہیں اور انہی کمروں میں لاکھوں، کروڑوں روپے کا فنڈ ذاتی اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی خرابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحصیلدار پولٹیکل نظام کا معمولی رکن ہوتا ہے۔ لیکن یہاں آنے والا ہر تحصیلدار گورنر کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ اور اسے اعلیٰ حکام کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور یہ لوگ کب تک قبائلی عوام کی قسمت اور زندگی سے کھیلتے رہیں گے۔ اس نظام کی وجہ سے مفاد پرستی کا ایک ایسا جال پھیل گیا ہے کہ انتظامیہ سے متعلق ہر شخص ناجائز ذرائع اور فنڈ قبائلیوں کا استحصال کر کے دولت کا ڈھیر سمیٹ رہا ہے ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف قبائل میں غربت، بے روزگاری، جہالت اور بیماری جیسے سنگین مسائل تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال سے قبائل متنفر ہیں۔ اور وہ اجتماعی مفاد اور قومی خواہشات کے مطابق پولٹیکل نظام میں ایسی تبدیلی چاہتے ہیں کہ قبائلی عوام کی اس نظام پر بالادستی قائم ہو جائے۔ من مانی اور لوٹ کھسوٹ کی کارروائیاں ختم ہوں اور کروڑوں روپے کے فنڈ قبائل کی فلاح و بہبود اور ترقیاتی اسکیموں پر خرچ ہوں، اختیارات کا غلط استعمال نہ ہو، حصول انصاف میں دشواری نہ ہو اور قومی مشکلات اور تکالیف کے سلسلہ میں، فوری، موثر، ٹھوس انتظام موجود ہو۔

پولٹیکل نظام کے ارد گرد بدنام اور بدکردار افراد کا جمگھٹا رہتا ہے۔ جو غلط تجاویز اور مشورے دے کر عوام کی زندگی کو مزید کٹھن اور دشوار بناتے ہیں۔ اگر کوئی اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو اسے ایف سی آر کے تحت ناکردہ گناہ کا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبائلی عوام میں اس نظام کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا ہے۔ وقت اور حالات کا تقاضہ ہے اور لاکھوں قبائلی عوام کا دیرینہ اور قومی مطالبہ بھی کہ پولٹیکل نظام کی جگہ ایک ترقی یافتہ، جدید اور جمہوری نظام رائج کیا جائے۔ تاکہ قبائلی حقیقی ترقی اور خوشحالی سے ہمکنار ہو سکیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قبائلی تنازعات اور مسلح تصادم میں پولٹیکل حکام غفلت، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے حالات پیچیدہ اور سنگین ہو جاتے ہیں اور کثیر جانی و مالی نقصان ہوتا ہے ان معاملات میں حکام کا رویہ اور پالیسی اب بھی وہی ہے جو انگریزوں کے زمانے میں تھی کہ تقسیم کر دو اور حکومت کرو

قبائلی عوام کو پاکستان کے دیگر حصوں کے برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان علاقوں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے علیحدہ انتظامیہ اور سیکرٹریٹ ہو، ٹھوس موثر اور فعال انتظامیہ کے ذریعے اسکیموں کو روبہ عمل لایا جائے اور عوام کو ان میں شرکت کا احساس پیدا کیا جائے، یہ بات بھی اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ قبائل میں تربیت یافتہ ملازمین اور تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں ہے۔ اس کے ٹرائبل کارپوریشن میں ایک بھی ڈائریکٹر قبائلی نہیں ہے جبکہ قبائلی علاقوں سے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر قبائلی سرکاری ملازمین ایسے بھی موجود ہیں جو ٹرائبل کارپوریشن کو بخوبی چلا سکتے ہیں۔ دیانت اور سرکاری ریکارڈ اور تجربے بھی مثالی ہیں۔ لیکن قبائل کی خواہشات کے برعکس اس کارپوریشن پر مخصوص ڈائریکٹروں کی اجارہ داری ہے۔ روزگار کا معاملہ یہ ہے کہ قبائل کے موزوں امیدواروں کو ٹرخا دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اپنی جگہ ایک بے چینی اور بدگمانی موجود ہے۔

قبائل کے سرسری مسائل کے پیش نظر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ قبائلی علاقوں کی ترقی، خوشحالی اور انہیں پاکستان کے دیگر شہروں کے برابر لانے کے سلسلہ میں ٹھوس اور مثبت انداز فکر اختیار کیا جائے گا۔

نمائندہ خصوصی

سانولی رنگت درمیانہ قد کاٹھ کی آصفہ رضوی سے واقفیت تو بہت پرانی تھی۔ نام اور کام کے حوالے سے لیکن ملاقات پہلی بار ہوئی۔ اس ملاقات کے لئے کافی طویل انتظار کرنا پڑا تھا۔ یہ سمجھیے کہ تقریباً ٣ ماہ۔ اس انتظار کی وجہ نہ ہماری بے پناہ مصروفیت تھی نہ آصفہ کے پاس وقت کی کمی۔ بس پٹ فیڈر کے مظالم کے خلاف تحریک اور اس کے بعد مچھ جیل ہمارے مل بیٹھنے میں حائل رہیں۔ اس انتظار کے بعد ملے تو یوں ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

چلتے پیتے اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کے بعد ہم نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے ان سے کہا کہ کچھ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیں۔ کہنے لگیں کہ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ اسی سرزمین کی بیٹی ہوں۔ کراچی میں پیدا ہوئی ہوں اور پوری انسانی برادری کو ایک خاندان تصور کرتی ہوں۔" ہم نے کہا کہ آخر ہمیں اور قارئین کو کیسے پتہ لگے کہ آپ کی اٹھان کہاں سے ہوئی اور کن عوامل نے آپ کو ابتلا اور آزمائش کی اس راہ کو اپنانے کی ترغیب دی اس پر انہوں نے بتایا کہ ان کے والد جناب ظفر عباس جارچوی صاحب پی ڈبلیو ڈی کے ملازم اور پرانے ٹریڈ یونین کارکن ہیں۔ چونکہ بہن بھائیوں میں یہ سب سے بڑی ہیں اس لئے بچپن ہی سے والد کے ساتھ جلسوں جلوسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ والد صاحب کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصّہ لینے کے "جرم" میں جن مشکلات اور تکالیف کا بار بار سامنا کرنا پڑا اور گھر پر اس کے جو اثرات مرتّب ہوئے اس کے ساتھ ساتھ والد صاحب سے ملنے کے لئے آنے والے مزدور جو مشکلات اور مصائب لے کر آتے تھے انہوں نے ان کے شعور کو مرتّب کیا ہے اور یہی شعور انہیں اس راہ پر چلا رہا ہے جس پر وہ بلاخوف و خطر گامزن ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کی سرگرمیوں کی خاندان کی طرف سے مخالفت تو نہیں ہوتی؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہ ہوتی؟ اگرچہ والد ظفر عبّاس جارچوی ٹریڈ یونین رہنما ہیں تو نانا مشہور عالم اور مسلم لیگی رہنما علاّمہ ابن حسن جارچوی مرحوم تھے۔ ایک مرحلے پر تو والد صاحب بھی خاندانی دباؤ کے سامنے جھکنے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن آصفہ نے مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ والد پھر ان کے ساتھ ہو گئے۔ ابھی جب وہ مچھ جیل میں تھیں تو انہوں نے لکھا تھا کہ آصفہ وہ کام کر رہی ہیں جو انہیں خود کرنا چاہیئے تھا۔ آصفہ کا جواب تھا آپ اپنا فرض ادا کر چکے اب مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

آصفہ بی ایڈ کر چکی ہیں اور آج کل قانون کی سال آخر کی طالبہ ہیں۔ بچپن سے ہی طالب علم سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ گرلز اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے جھنڈے تلے تحریکوں میں حصّہ لیتی رہیں۔ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کی اسٹوڈنٹس یونین کی ١٩٧٥ء کے لئے صدر منتخب ہوئیں اور اسی حیثیت میں آئی سی بی کی وائس چیئرمین منتخب کی گئیں۔ اس سے قبل ١٩٦٥ء میں اپوا کالج کی ہڑتال میں حصّہ لیا تھا۔ طالبات کے مطالبات تو منظور ہو گئے لیکن یہ کالج سے نکال دی گئیں۔ ٦٨ء اور ٧٠ء میں کالج اساتذہ کی تحریک اور بھوک ہڑتال میں حصّہ لیا۔ ٧٣ء میں پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تحریک اور بھوک ہڑتال میں جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ آج کل سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی نائب صدر اور کراچی کی سکریٹری ہیں۔ یہ تنظیم مزدور کسان طلبا عوامی رابطہ کمیٹی کی اہم رکن ہے۔ اور آصفہ اس کمیٹی کی بھی کراچی کی سکریٹری ہیں۔

تعلیم کی بات چل رہی تھی۔ ہم نے پوچھا کہ ایک تربیت یافتہ استاد کی حیثیت سے وہ ملک کے نظامِ تعلیم کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟ اس کے جواب میں آصفہ نے بتایا کہ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو موجودہ سماجی نظام کا ایک حصّہ سمجھتی ہیں۔ سماجی نظام کی طرح تعلیمی نظام بھی فرسودہ اور غیر حقیقی ہے۔ اساتذہ کو جدید طریقوں کے مطابق تربیت دینے کی کوشش تو کی جاتی ہے لیکن انہیں برتنے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ اسکولوں میں امدادی اشیاء تو دور کی بات ہے چاک اور ڈسٹر تک دستیاب نہیں۔ بچوں کے بیٹھنے کے لئے بینچیں موجود نہیں ہیں۔ یہی صورتِ حال کالج کی سطح پر ہے۔ لیبارٹریاں ضروری ساز و سامان کو ترستی ہیں۔ پھر طلبا کے لئے مضامین کا انتخاب رجحان اور میلان کے مطابق نہیں ہوتا۔ جس شعبے میں زیادہ کمائی نظر آتی ہے سب اسی طرف دوڑتے ہیں۔ اس طرح طالب علم اپنے رجحان اور ذریعہ معاش کے تضاد میں پھنس کر مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔ اس کے تخلیقی ذہن کو ترقی دینے کی بجائے اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد تنگ نظری ہے۔ اسے مجموعی انسانی تاریخ سے کاٹ دیا جاتا ہے اور طالب علم کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک رنگدار عینک اپنی آنکھوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چڑھا لے۔ اس میں کردار کی پختگی کہاں سے آئے گی جب کہ اسے غور و فکر کر کے آزادی کے ساتھ حالات کا تجزیہ کر کے اپنی رائے قائم کرنے سے ہی روک دیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا کوئی سماجی نکتۂ نظر نہیں ہے۔ نصاب کی کتابوں کا عالم یہ ہے کہ ان کا حال سے اور مستقبل سے کوئی واسطہ نہیں۔ ابھی تک مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر نہ تو اپنایا گیا ہے نہ اس ضمن میں کوئی کوشش ہو رہی ہے اس طرح طلبا کی صلاحیتوں کو نکھرنے سے روکا جا رہا ہے۔ ان کی نظر میں تعلیمی ماحول اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک سیکولر اور سائنٹیفک نکتۂ نظر نہ اپنایا جائے۔ طلبا کو ان کے میلان کے مطابق تعلیم دینے کا بندوبست نہ کیا جائے۔ ہر سطح پر تعلیم لازمی اور مفت قرار نہ دی جائے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد روزگار کی ضمانت نہ فراہم کی جائے۔ تعلیم اور روزگار کی مساویانہ بنیادوں پر ضمانت فراہم ہو تو کوٹہ سسٹم کا مسئلہ بھی حل

"مدد کرنے آئی ہو تو میرے تین لڑکوں کا پتہ لگاؤ"

وفد کے ارکان کو زدوکوب کیا گیا اور حبس بیجا میں رکھا گیا

ہو جائے گا یعنی اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آصفہ رضوی نے کہا کہ طلبا میں صلاحیت اور مہارت پیدا کرنے کے لئے پوری قوم اپنا پیٹ کاٹ کر سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ لیکن موجودہ سماجی ڈھانچے میں ان صلاحیتوں کو ذاتی مفاد کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے اور پیسہ کمانے کے لالچ میں باصلاحیت افراد ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار ممالک کے ہاتھوں استحصال کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ وسیع اور تیز رفتار صنعتی ترقی کے ذریعے ہی زیادہ روزگار کے امکانات پیدا کر کے نہ صرف ہم اپنے انسانی اور سائنسی وسائل سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ ملک کو اقتصادی غلامی سے بھی نجات دلا سکتے ہیں۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں آصفہ رضوی نے کہا کہ خواتین دوہرے استحصال کا شکار ہیں۔ قدیم روایات اور مراعات یافتہ طبقے خواتین کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ ان کے لئے روزگار کے مواقع انتہائی محدود ہیں۔ بعض شعبوں میں ابھی تک مردوں کے برابر کام کرنے کے باوجود ان کے مقابلے میں کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ دیہات کی عورت شہری عورت سے زیادہ استحصال کا شکار ہے وہ مرد سے زیادہ کام کرنے کے باوجود کسی حق کی بات بھی نہیں کر سکتی۔ جاگیردارانہ رشتوں کے نتیجے میں دیہات میں محنت کش عورت کی عزت تک محفوظ نہیں وہ اپنی بربادی کی داستان بھی دوسروں کو نہیں سنا سکتی۔ استحصال سے نجات کی جدوجہد میں خواتین کے مسئلے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

ہم نے درخواست کی کہ آصفہ ہمیں پٹ فیڈر جدوجہد میں شرکت اور جیل یاترا کے بارے میں بتائیں۔ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ پوری روئیداد سنائی۔ جسے لفظ بہ لفظ بیان کرنے کی گنجائش۔۔۔ نہیں جستہ جستہ آپ بھی ملاحظہ کر لیں ؛

۱۷ فروری کو مزدور طلبہ کسان عوامی رابطہ کمیٹی نے پٹ فیڈر میں کسانوں کے قتل عام کی خبریں سن کر سب سے پہلے ایک وفد صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ اس وفد نے آ کر وہاں کی صورت حال کی رپورٹ کی۔ اس کے بعد پٹ فیڈر کے کسانوں کا ایک وفد بھی کراچی آیا۔ اس وفد نے یہاں مزدوروں، طالب علموں کے مختلف اجتماعات کو کسانوں پر جاگیرداروں کی مسلح لشکر کشی کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس وفد کی اپیل پر یہاں کی رابطہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ایک وفد کسانوں کی جدوجہد میں عملی یک جہتی کے لئے پٹ فیڈر بھیجا جائے۔ اس وفد میں آصفہ رضوی سیکرٹری رابطہ کمیٹی، پاکستان ورکرز فیڈریشن کے رہنما محمد الطاف، سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی رہنما حمیدہ گھانگھرو، نواب شاہ سے طالب علم رہنما شہاب الدین اور حیدر آباد سے مزدور ساتھی محمد سلیم شامل تھے۔ یہ وفد جب پٹ فیڈر پہنچا تو کسانوں نے اس کا بہت پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ مزدوروں اور طالب علموں کی طرف سے ان کی زندگی میں پہلی بار مدد آئی ہے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم پہلے بھی ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں لیکن ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ آپ لوگ ہماری آواز سن کر آتے ہیں۔ ہم جاہل لوگ ہیں کچھ نہیں جانتے آپ جو کہیں گی ہم کریں گے۔ ہم جیل سے نہیں ڈرتے، کوڑے سے نہیں ڈرتے، مرنے سے نہیں ڈرتے۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی، کیوں نہ عزت کی موت مریں۔ ہمارے جانے سے پہلے کسانوں نے اپنے مطالبات کی حمایت میں ۱۹ فروری کو جلوس نکالا۔ اس میں پٹ فیڈر کے ہر علاقے سے کسان جمع ہوتے تھے ہزاروں کا مجمع تھا۔ یہ جلوس اتنا بڑا تھا کہ انتظامیہ بزور قوت بھی اسے ختم نہ کر پائی۔ بالآخر ڈپٹی کمشنر نے قرآن شریف سر پر اٹھا کر کہا کہ تین دن میں مسائل حل کر دیں گے لیکن تین دن کے بعد بھی مطالبات تسلیم نہ ہوتے جس پر کسان اب کہتے ہیں کہ انتظامیہ خانہ کعبہ بھی اٹھا لاتے تو ہم اس پر یقین نہ کریں گے جس کے بعد کسانوں نے ۲۲ فروری کو ٹمپل ڈیرہ میں مکمل ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ انتظامیہ نے بہت بھاری جمعیت کے ساتھ جلوس روکنے کی کوشش کی لیکن سنگینوں کے باوجود کسانوں نے جلوس نکالا۔ جلوس میں کسان اتنی بڑی تعداد میں شریک تھے کہ انتظامیہ کو فائرنگ کی ہمت نہ ہوئی۔

ہم جب ٹمپل ڈیرہ پہنچے تو ہمیں پتہ چلا کہ کسانوں نے مزدوروں کی ۱۶ فروری کی کال پر یوم جدوجہد منایا۔ کسانوں نے اعلان کیا کہ وہ ۱۶ فروری سے بھوک ہڑتال کا آغاز کریں گے لیکن ۱۴ فروری کو کراچی کے مزدور رہنما محمد رمضان طالب علم رہنما غلام اکبر عمرانی اور ٹمپل ڈیرہ رابطہ کمیٹی کے سیکرٹری پیر بخش سامت اور دیگر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں انہیں ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

۵ مارچ سے وفد نے پٹ فیڈر کے علاقے کا دورہ کیا۔ گاؤں گاؤں گئے جس گاؤں بھی پہنچے کسانوں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور جدوجہد میں ہر قربانی دینے کا وعدہ کیا۔ دیہات کی خواتین وفد میں شامل لڑکیوں سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ وہ پڑھی لکھی نہیں ہیں ورنہ وہ بھی ان لڑکیوں کی طرح جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ ان میں سے بعض خواتین نے قدیم بوسیدہ روایات کے خلاف بھوک ہڑتال کرنے کے لئے اپنے نام پیش کئے۔ جس گوٹھ پر فائرنگ کی گئی تھی وہاں کی خواتین ظلم و بربریت کی داستان رو رو کر سناتی رہیں، ایک عورت بہت بری طرح رو رہی تھی اس نے کہا کہ اگر ہماری مدد کرنے کو آئے ہو تو ہمارے گھر کے تین لڑکوں کا پتہ لگاؤ جو ایک ساتھ نکلے تھے اور اب تک لاپتہ ہیں ان کے نام تھے حمزہ ولد محمد عیسیٰ، عبدالرزاق ولد رسول بخش۔ عبدالحمید ولد بہارن، ایک اور خاتون جو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں نے کہا کہ دیکھو ہمارے گھر کی کچی دیواروں میں یہ گولیوں کے نشان ہیں، اس وحشیانہ فائرنگ کی دہشت سے میری بچی لال خاتون (جس کی عمر نو دس سال تھی) خون کی قے کر کے موت کی نیند سو گئی۔ خواتین نے یہ بھی بتایا کہ ان تین نوجوانوں کے علاوہ چار اور نوجوانوں کا بھی کوئی پتہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جاگیرداروں کی اپنی جیلیں ہیں وہ لوگوں کو اٹھوا کر اپنی ذاتی جیلوں میں بند کر دیتے ہیں۔ ہماری مدد کرنے آتے ہو تو انہیں چھڑا کر لاؤ۔ ایک خاتون نے اپنا کرتا اٹھا کر کہا کہ دیکھو بھوک سے ہمارا پیٹ سوکھ گیا ہے ہمارے پاس اناج ختم ہو گیا ہے۔ پچھلی فصل کے تھوڑے سے چاول ہیں جن سے ہم بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں جو غلہ ہمیں واپس ملا ہے وہ سڑ چکا ہے اسے جانور بھی نہیں کھا سکتے۔ لوگ خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ اچانک حملے کے خوف سے راتوں کو سو نہیں سکتے۔ انہوں نے ایک واقعہ بتایا کہ محمود ماچھی نامی ایک کسان نے مقدمہ جیتا اور اپنی زمین کا قبضہ حاصل کر لیا۔ لیکن ۲۴ فروری کو جاگیرداروں نے اسے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس کے گھر والے جان بچانے کی خاطر زمین چھوڑ کر چلے گئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارا مسئلہ صرف زمین کا واپس ملنا نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ ہماری جانوں کے تحفظ کی ضمانت بھی ضروری ہے۔

۱۱ مارچ تک گاؤں گاؤں جانے کے بعد ہم نے حسب ذیل مطالبات مرتب کئے۔

ا۔ کسانوں کو غلہ اور اسلحہ واپس کیا جائے۔ ان پر

قائم شدہ مقدمات ختم کئے جائیں۔ کسانوں کے رہنماؤں کو رہا کیا جائے۔ شہید ہونے والوں کو معاوضہ دیا جائے۔ قاتلوں کو گرفتار کر کے انہیں سزا دی جائے۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۷ کے مطابق الاٹ شدہ زمین پر کسانوں کے حق ملکیت کو تسلیم کیا جائے اور تحفظ کے ساتھ قبضہ دیا جائے۔

ان مطالبات پر ۱۲ مارچ صبح دس بجے سے ٹمپل ڈیرہ میں اڑتالیس گھنٹے کی بھوک ہڑتال شروع کی گئی۔ بھوک ہڑتالی جتھہ گیارہ افراد پر مشتمل تھا۔ میں، حمیدہ گھانگرو، محمد سلیم اور الطاف الرحمٰن (مزدور) پیر شہاب الدین (طالب علم نواب شاہ) محمد عطا عمرانی (سکریٹری بی ایس او دستہ محمد) محمد بخش، محمد اکبر، حق داد، سکندر ربروہی، محمد انور (کسان)

لیکن شام پانچ بجے ایس ڈی ایم عبدالرحمٰن نے نہ صرف ان گیارہ افراد کو بلکہ وہاں موجود لوگوں میں سے سات دوسرے افراد کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں ایک ۹ سالہ لڑکا محمد اختر بھی تھا جو وہاں موجود کسانوں کو پانی پلا رہا تھا۔ گرفتاری کے وقت پولیس کی بھاری جمعیت بلائی گئی تھی۔ جھٹ پٹ سے بھی پولیس کے دستے بلوائے گئے تھے۔ جنہوں نے ان ہزاروں کسان مردوں اور عورتوں کو بھوک ہڑتالیوں کے قریب آنے سے روک رکھا تھا ڈپٹی کمشنر اور لیوی کے انچارج سمیت سارے انتظامی افسران موجود تھے۔ ان لوگوں نے اشتعال دلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ لیوی انچارج تو اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے ناظم کو بزدل قرار دیا اور کہا کہ نو بجے تک وہ اپنی ذمہ داری پر بھوک ہڑتالیوں کو اٹھا لے جائیں گے۔

گرفتاری کے بعد مقامی کسانوں کو ٹمپل ڈیرہ میں زیر حراست رکھا گیا جب کہ باہر سے آنے والوں کو مچھ بھیج دیا گیا۔ واضح رہے کہ یہ گرفتاری بغیر کسی وارنٹ کے عمل میں لائی گئی تھی۔ ہمارا قافلہ رات تین بجے مچھ جیل پہنچا مچھ جیل کے حکام کو ٹیلی فون پر ہدایت کر دی گئی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے تین ساتھی لڑکوں کو بری طرح مارا پیٹا گیا۔

مچھ جیل میں ہمیں حبس بے جا میں رکھا گیا کیونکہ نہ تو ہمیں کو یری حکم دکھایا گیا نہ ہی کسی عدالت سے ریمانڈ لیا گیا یہی بات ہم نے ۱۱ اور ۱۶ اپریل کو جیل حکام کو دی جانے والی درخواستوں میں کہی تھی۔ اس کے بعد حکام نے ہمیں ٹمپل ڈیرہ بھجوایا جہاں ناظم کی غیر موجودگی میں ہمیں تحصیلدار کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مقدمے کی سماعت نہیں ہو سکتی کیونکہ ناظم موجود نہیں ہے کمشنر سے رابطہ قائم کرنے سے ہمیں بتایا گیا کہ ہمارا معاملہ ہوم سکریٹری کے پاس ہے۔ ۲۷ اپریل کو سماعت ہوگی۔ چونکہ لوگوں میں ہمارے ٹمپل ڈیرہ لائے جانے کی خبر پھیل گئی تھی اس لئے ہزاروں کسان سڑکوں پر جمع ہو گئے تھے جس سے انتظامیہ کافی پریشان ہو گئی تھی۔ بہر حال بڑی مشکل سے ہمیں واپس مچھ جیل پہنچایا گیا۔ یہاں ۲۳ اپریل کو ایک بریگیڈیر صاحب تشریف لائے لیکن انہوں نے خود کو ہمارے معاملے سے ناواقف ظاہر کیا جیل میں مختلف طریقوں سے ہم پر دباؤ ڈالا جاتا رہا کہ کوئی گول مول سی تحریر دے دیں تو ہماری رہائی ہو جائے گی لیکن ہم تمام ساتھیوں نے انکار کر دیا۔ اور آخر تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ بریگیڈیر صاحب وعدہ کر گئے تھے کہ ۷ مئی کو ہمارے مقدمے کی سماعت ہوگی۔ جیل میں ہم نے خضدار کے طلباء کے ساتھ مل کر یوم مئی منایا۔ بالآخر ۱۴ مئی کو ہمیں ٹمپل ڈیرہ لایا گیا۔ ایک بار پھر تحریری

مسئلہ صرف زمین پر قبضہ دلانا ہی نہیں کاشتکاروں کی جانوں کا تحفظ کرنا بھی ہے

یقین دہانی کا مطالبہ کیا گیا۔ ہم نے مقدمہ چلانے اور کاغذات کی نقلیں فراہم کرنے پر زور دیا۔ بہر حال دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں (جس کی انتہائی سزا ایک ماہ ہے) دو ماہ دو دن حراست میں گزارنے کے بعد ہماری رہائی عمل میں آئی۔

ہم نے آصفہ سے پوچھا کہ اس تجربے سے گزرنے کے بعد آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں اس تجربے نے بہت اعتماد بخشا ہے۔ محنت کش طبقوں میں اتحاد کی کوششوں میں کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی۔ بلوچستان کے طلبا اور عوام نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی اور ہر طرح ہماری خبر گیری کی۔ خضدار میں اور دوسرے مقامات پر ہماری رہائی کی مہم چلائی گئی۔ ہم ان سب کے بے حد مشکور ہیں۔

اپنی تنظیم کے بارے میں آصفہ رضوی نے بتایا کہ مزدور، طلبا، کسان عوامی رابطہ کمیٹی ایک طبقاتی تنظیم ہے۔ اس نے ہمیشہ تمام طبقاتی تنظیموں، جمہوریت پسندوں اور محب وطن عناصر کے ساتھ عملی تعاون کیا ہے۔ مزدوروں اور طالب علموں کی عملی یک جہتی کا ثبوت ہٹ فیڈر میں کسانوں کی جدوجہد میں دیا ہے۔ صحافیوں کے آزادی تحریر کے لئے عملی تعاون کرتے ہوئے حیدرآباد میں قید و بند کی صعوبتوں اور کوڑوں کی وحشیانہ سزا کو بخوشی قبول کیا ہے اور اس جمہوری لڑائی کے کامیاب اختتام تک تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔

آج این ڈی وی پی اساتذہ کے شانہ بشانہ علم کے فروغ اور اساتذہ کے تقدس کے لئے علم بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی کراچی میں اساتذہ کی جدوجہد کا ہر مرحلے پر ساتھ دیا ہے۔ دیر کے عوام کا مسئلہ ہو یا دیہہ مبارک، نیو سعید آباد یا نواب شاہ ضلع میں داد کے کسانوں کا مسئلہ ہو، ملتان کے مزدوروں کا مسئلہ ہو، خضدار میں طالب علموں پر فائرنگ کا مسئلہ ہو یا میانوالی کے کسانوں کی گرفتاری، رابطہ کمیٹی نے ہمیشہ عملی تعاون کیا ہے، آج ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں صحافیوں سے ان کی لڑائی میں شرکت کی اجازت کی قطعی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آزادی صحافت صرف صحافیوں کا مسئلہ نہیں یہ جمہوریت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ یہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے اور اسی لئے رابطہ کمیٹی نے اپنی یک جہتی کا ثبوت دیتے ہوئے طالب علموں اور کسانوں کو صحافیوں کی حمایت میں حیدرآباد میں بھوک ہڑتال پر بٹھایا۔ اور حیدرآباد میں اب تک رابطہ کمیٹی کے ۴۲ افراد گرفتار ہو چکے ہیں۔

آخر میں رابطہ کمیٹی کی جانب سے انہوں نے اپیل کی کہ آج رجعتی طاقتیں بالکل کمزور ہو چکی ہیں۔ آج دنیا بھر میں سامراج کی شکست و ریخت کا دور ہے۔ آج رجعتی طاقتیں حملہ آور ہونے کے بجائے اپنے دفاع میں مصروف ہیں۔ اور یہ وقت ہے کہ ان کے خلاف تمام طبقاتی لڑائیوں کو مربوط کیا جائے اور طبقاتی تنظیموں کے اتحاد اور جمہوریت پسند محب وطن افراد کی مشترکہ جدوجہد کے ذریعہ ایک ایسی ضرب لگائی چاہیے کہ ظلم، ناانصافی اور استحصال کا ڈھانچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔

آصفہ رضوی گو کہ اب بھی اسی نام سے جانی جاتی ہیں لیکن شادی کے بعد رواجی طور پر وہ آصفہ تنویر شیخ ہو گئی ہیں۔ دوستوں کی رائے میں حال ہی میں ہونے والی یہ شادی دو باشعور ذہنوں، دو سیاسی کارکنوں کی یکجائی ہے۔

باپ کو نااہلی کا سرٹیفکیٹ ملا تو بیٹے نے الیکشن سیل کے دربار میں حاضری دے دی

ہوا کے رخ پر چلنے والے عوامی محاسبے سے خائف ہیں

تھرپارکر پیپلز پارٹی کی وڈیروں پر مشتمل اعلیٰ قیادت اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کے معاملے میں تذبذب کا شکار ہے اقتدار کی سمت کا تعین کرنے کے سلسلے میں ناکامی نے اسے ذہنی خلجان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جب کہ ایک طرف ان کے سروں پر عوامی نمائندگی کے لئے نااہلی کے قانون کی تلوار لٹک رہی ہے تو دوسری طرف جمہوری قدروں سے بے وفائی کے صلے میں عوامی احتساب کا ڈنڈا اس مشکوک پوزیشن میں ان ملکیت یافتہ لوگوں سے اپنے طبقاتی مفادات سے روگردانی کر کے مارشل لا احکام سے ٹکر لینا تو کسی طور بھی ممکن نہیں مگر دوسری طرف یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ عوام کے بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کی تند ہواؤں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا جائے گا جس کے جواب میں عوام کے اتحاد کا مضبوط ڈنڈا ان کے سیاسی لاشے کا حلیہ بگاڑ دے۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ضلع تھرپارکر کی تینوں قومی اسمبلی کی نشستوں پہ پیپلز پارٹی کے پیر غلام رسول شاہ جیلانی، سید خادم علی شاہ اور نیاز محمد وسان منتخب ہوئے تھے۔ پیر غلام رسول شاہ جیلانی عرصہ دراز سے اس علاقے میں اپنی اہمیت کی بنیاد پہ سندھ کی سیاست پر حاوی رہے ہیں۔ پیر صاحب ایوب خان مرحوم کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور مرحوم کے زوال تک ان کی غیر مشروط حمایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی حمایت میں ایک جلوس منظم کرنے کی کوشش میں اپنا جلوس نکلوا کر گوشہ نشین ہوئے مگر ۱۹۶۹ء میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک سے متاثر ہو کر پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے اور ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں تھر کی سیٹ پر کامیاب ہو کر علاقے کے عوام کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملکیت میں اضافے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بے گھر ہونے والے تھری مہاجرین کے لئے آئی ہوئی امداد کی تقسیم کے سلسلے میں بنائی گئی کمیٹی کی قیادت کرتے ہوئے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ مل کر تھری عوام کی اس قدر خدمت کی کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اپنا حلقۂ انتخاب تبدیل کرنا پڑا۔ تھرپارکر ۱ کی سیٹ سے مقابلہ ہوا اور سکرات کے عالم سے گذر کر کامیاب ہوئے۔ سیاسی مبصرین کے مطابق ہر اقتدار کے سورج کی کرنوں سے پیر صاحب کی کوٹھی کا لان ضرور روشن ہوتا ہے۔ اس لئے ایوب خان کے اقتدار کا دھڑن تختہ کرانے کے بعد پیپلز پارٹی کی عوامی حکومت کے زیر سایہ عوام کی گراں قدر خدمت انجام دیتے رہے۔ تاوقتیکہ اُس منتخب حکومت کا آپریشن فیئر پلے کے ذریعہ تختہ اُلٹا گیا۔ اس کے بعد سے پیر صاحب کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں

ہنس مکھ، سنجیدہ مزاج اور گہری سیاسی بصیرت رکھنے والے پیر غلام رسول شاہ جیلانی کا اس حادثہ کے بعد بھی پیپلز پارٹی کے سیاسی منظر پہ موجود رہنا حیرت کا باعث تھا جب کہ ان کے اصول سیاست کے مطابق لوگ یہ توقع رکھتے تھے کہ پیر صاحب اپنی پرانی حکمت عملی پہ قائم رہتے ہوئے ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے عبوری حکومت سے تعاون کریں گے۔ اور اپنے دیرینہ رفیق قائد عوام کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اسی دوران یہ خبر آئی کہ پیپلز پارٹی کو انتہا پسندوں سے پاک کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں ۵۵۷ برانڈ لبرل لیڈر کوثر نیازی سندھ کے دورے پر تشریف لائے۔ اور پارٹی میں موجود لبرل عناصر سے ملاقات کرتے رہے۔ اس بارے میں ٹنڈوالہ یار میں پیر صاحب کے بھی نیازی صاحب سے ملاقات کرنے کی خبر ... مگر فوراً ہی تردید ہو گئی۔ تردید کی وجہ لوگوں کے کہنے کے مطابق عوامی ڈنڈے کا خوف سنا جاتا ہے بغرض احتیاط ہی سہی مگر پیر صاحب اس قدر مستقل مزاجی سے ایک پارٹی کے منظر پیچھے رہے ورنہ اثنا موصوف نااہلی کے خصوصی ٹریبونل سے نااہل قرار دیئے گئے اور نااہلی کا سرٹیفکیٹ لے کر میرپورخاص تشریف لائے۔ پرسے کے لئے آنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ پیر صاحب ان سے ملتے وقت ہشاش بشاش رہ کر یہ اظہار کرتے رہے کہ زندہ شہید ہوں آزمائش میں پورا اتروں گا اور کسی صورت میں بھی بھٹو صاحب سے وفاداری تبدیل نہیں کر سکتا۔ سنا گیا ہے کہ ملنے آنے والوں میں سے ایک ناعاقبت اندیش نے موجودہ صورت حال کی گھمبیرتا کی طرف پیر صاحب کی توجہ مبذول کرائی اور درخواست کی کہ آپ تو نااہل ہو چکے، خدارا چھوٹے پیر صاحب پیر آفتاب شاہ جیلانی کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچائیں اور ان کو ملک و قوم کی بقا کے لئے حکمران وقت سے تعاون کی اجازت دے دیں۔ اس وقت تو پیر صاحب نے اپنے وفادار معتقد کی خواہش کو ہنس کر ٹال دیا۔ مگر کچھ دنوں بعد قومی حکومت کے منصوبے میں ناکامی کے بعد سیاسی حکومت کی ولادت کے لئے ملبہ اکٹھا کرنے کی مہم پر الیکشن سیل سندھ کی پھیری پہ آیا تو معلوم ہوا کہ پیر آفتاب شاہ جیلانی بھی سندھ کے دیگر خالی بوتلوں خالی ڈبوں کی طرح ملاقات میں موجود تھے۔ پیر آفتاب کی الیکشن سیل سے ملاقات نے یہ بات صاف کر دی کہ جیلانی خاندان اپنی وضعداری کو قائم رکھتے ہوئے ہوا کے رُخ پہ چلنے کے لئے بے چین ہے۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا یہ خیال ہے کہ سی ایل۔ ایم اے کے تھرپارکر کے دورے کے وقت جیلانی خاندان کے چیف ورکر اور خلیفۂ خاص جناب حسین بخش مری ان شہریوں کے وفد میں ملاقات ... جنرل صاحب سے گفتگو کے دوران یہ کہنا ... جنرل صاحب خدا کا شکر ہے پاکستان بچ لیا گیا۔ خالی از علت نہ تھا

آفتاب شاہ جیلانی کی الیکشن سیل سے ملاقات کی روشنی میں پیپلز پارٹی کے کارکن یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ۱۸ مئی کو الیکشن سیل سے ملاقات کرنے والے پچپیس رکنی وفد میں آفتاب شاہ جیلانی کی عدم موجودگی کے باوجود جیلانی خاندان کی دعائیں اور نیک خواہشات کوثر نیازی کے ساتھ ہیں مگر عوامی خوف نے برملا اظہار سے باز رکھا ہے۔

سیاسی حلقوں کے مطابق ضلع کی سیاست میں نو وارد نیاز محمد وسان دونوں جانب رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ موصوف سندھ کے معروف سیاستدان غلام محمد وسان کے بھانجے ہونے کی حیثیت سے اپنے ماموں کی سیاسی وراثت کے حقدار ٹھہرے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غلام محمد وسان ۱۹۷۰ء کے انتخابی معرکہ میں اسلام کو خطرے سے نکالنے کے لئے پیپلز پارٹی کے ملحدوں میں سے ایک میر علی بخش تالپور سے نبرد آزما ہوتے اور اپنی دیوہیکل سیاسی شخصیت لاکھوں روپے کے صرفے اور اسلام پسند جماعتوں کی روایتی حمایت کے باوجود چاروں شانے چت گرے۔ شکست کا غم وسان صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ٹی وی پر نتیجہ سنتے ہوتے ہارٹ اٹیک ہوا اور انتقال فرما گئے۔ اس حادثہ نے وسان خاندان کو اپنی سیاسی وفاداری تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ آخر کار نیاز محمد وسان اپنے آبائی گاؤں کنڈیاری میں بھٹو صاحب کی پُرتکلف دعوت کرکے ڈنکے کی چوٹ پر پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ مارچ ۷۷ء کے انتخاب میں تھرپارکر ۳ کے حلقے سے بلامقابلہ منتخب ہو کر منتخب ہونے والی وفاقی حکومت میں سائنس اور ٹکنالوجی کے وزیر بنے وہ دوسری بات ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی سے موصوف کا دور تک واسطہ نہیں۔ جب ۷۷ء کی منتخب اسمبلی کا تختہ بغرض حصول جمہوریت الٹا گیا تو موصوف بھی ابتدا میں عتاب کا شکار ہوتے۔ اخباری خبروں کے مطابق وجہ عتاب یہ ہوئی کہ نیاز صاحب کے مینجر کراچی سے حیدرآباد صاحب کا اٹیچی کیس لاتے ہوتے پکڑے گئے۔ جس میں غیر ملکی کرنسی کے علاوہ برہنہ تصویریں اور کئی پاسپورٹ موصوف کے نام کی معمولی تبدیلی سے پاتے گئے۔ بیچارہ مینجر پکڑا گیا اور تحقیقات شروع ہوئی۔ تحقیقات کا نتیجہ کیا نکلا پتہ نہ چل سکا مگر موصوف بفضلہ تعالیٰ آزاد گھوم رہے ہیں۔ ان کے قریبی حلقوں کے مطابق پیر پگارا کے دیرینہ خاندانی مراسم کام آتے۔ اسی لئے نیاز صاحب عموماً اپنے وفاداروں میں یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ حکومت کوئی بھی آتے ہماری ہی ہوگی۔ نیاز صاحب کے جتوئی صاحب سے بھی بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ اس صورتِ حال کی بنیاد پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا یہ احساس کے موصوف بھی وقت کا انتظار کر رہے ہیں کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا۔

تیسری اہم شخصیت سیّد خادم علی شاہ کی ہے ان کے بارے میں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ بلوچستان کے رئیسانی صاحب سے ان کے بڑے گہرے مراسم ہیں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق رئیسانی صاحب شاہ صاحب کے سیاسی استاد ہیں۔

موصوف مارچ ۷۷ء کے انتخابات میں تھرپارکر ۲ کی قومی نشست پر کامیاب ہو کر اپنے مربّی رئیسانی صاحب کے ذریعہ وزارت حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش میں ناکام ہو کر ضلع پیپلز پارٹی کی صدارت پر اکتفا کیا۔ مارشل لا کی آمد کے بعد خاموشی اختیار کی مگر جب کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو اپنے آبائی گاؤں چلے گئے۔ اور سیاسی سرگرمیوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا جس کا ثبوت بے نظیر بھٹو کے تھرپارکر کے دورے میں ان کی عدم موجودگی ہے۔ بعد میں جناب بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ سے پھانسی کا حکم سنانے سے پہلے ضلع بھر میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا جن میں جمال منگریو، عبدالغفور اور اللہ بچایو اسیر سمیت کئی کارکنوں کو ایک ایک سال قید کی سزا سنائی گئی تو کارکنوں کو شاہ صاحب کی عدم موجودگی سے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ شاہ صاحب صدر ہونے کے باوجود اس معاملے میں دلچسپی لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

سنا گیا ہے کہ سزا یافتہ کارکن مختلف جیلوں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں مگر ان کے حوصلے بلند ہیں وہ بات دوسری ہے کہ ان مسکینوں کے ورثا فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ سیّد خادم علی شاہ اب کچھ دنوں سے شہر میں دیکھے جاتے ہیں اور وہ اب کوشش کر رہے ہیں کہ کارکنوں کا اعتماد حاصل کریں عموماً اپنی شام کی کچہریوں میں بھٹو خاندان سے اپنی محبت اور وفاداری کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سابق سینیٹر قربان علی شاہ کے ذکر کے بغیر تھرپارکر کی سیاست پوری طرح واضح نہیں ہوسکتی۔ شاہ صاحب ایوب خان کے خلاف تحریک کے زمانے میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی لابی سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے شعلہ بیا[ن] مقرر مانے جاتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار کے ابتدا[ئی] زمانے میں بھی کارکنوں سے تعلق رکھا۔ مگر بُرا ہو شاہ [صاحب] کی ممبر اسمبلی بننے کی خواہش کا کہ موصوف کارکنوں سے چھ[وٹ] گئے اور دوسری طرف پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت ان کی

قربان علی شاہ

تیز و تند تقریروں کی وجہ سے ان سے نالاں رہی۔ بارہا کوششوں کے باوجود قومی یا صوبائی کی ممبری حاصل نہ کر سکے۔ آخرکار ممتاز بھٹو کی دوستی کام آئی اور سینیٹر منتخب ہوئے۔ آخری دنوں میں سینیٹری ختم ہونے کے بعد مارچ ۷۷ء کے انتخابات میں صوبائی کی نشست کے لئے پارٹی ٹکٹ کی درخواست کی۔ ممتاز بھٹو کی بھرپور کوشش کے باوجود ٹکٹ نہ مل سکا۔ اس لئے آزاد کھڑے ہوئے مگر صوبائی انتخابات نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس مرتبہ بھی اسمبلی کی نشست سے محروم رہے! اسی دوران قومی اتحاد کی چلائی جانے والی تحریک کے دوران مسلم لیگ پگارا گروپ میں شامل ہو گئے۔ اور پھر اکتوبر انتخابات میں صوبائی اور قومی کی نشست پر مقابلے کی تیاریاں شروع کیں لیکن یہ الیکشن بھی ملتوی ہو گئے۔ اب شاہ صاحب قومی اتحاد کی غیر جمہوری روش پر افسوس اور بھٹو خاندان کے جمہوریت کی بحالی کے لئے مجاہدانہ کردار کا ذکر کرتے پائے جاتے ہیں اور احتساب کی زد میں ہونے کے باوجود ممتاز بھٹو سے سندھ ہائی کورٹ میں ان کی پیشی کی تاریخوں میں کئی ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ قریبی ذرائع کے مطابق احتسابی عمل سے فارغ ہونے کے بعد شاہ صاحب پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔

مگر دوسری طرف پیپلز پارٹی لیڈر شپ کی اس بے حسی کے باوجود عوام تمام کرداروں کو گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ آخری فیصلہ انہیں کو کرنا ہے۔ بظاہر سکوت ہے مگر کوئی بھی کسی بھی سمت سے کوئی غلط فیصلہ عوام کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا۔ ضلعی انتظامیہ اپنی تمام انتظامی ذمہ داریوں سے دست کش ہو کر مثبت نتائج کے حصول کی کاوشوں میں مصروف ہے جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہاریوں کی بیدخلی مزدوروں کی حاصل شدہ مراعات کا خاتمہ۔ بیج بھان کی قیمت کی جبری وصولی سے ان طبقوں کی زندگی "اجیرن" ہو گئی ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے سب طرف امن ہے کا ترانہ سنا رہے ہیں۔ جب کہ چوری، قتل اور زنا بالجبر کے واقعات عام ہیں۔ ابھی چند دن قبل شادی پلی اور میرپور خاص کے درمیان ایک گوٹھ میں ایک ہاری کی بیوی سے زیادتی کرتا ہوا ایک زمیندار پکڑا گیا جس پر ہاریوں اور زمیندار کے حواریوں میں تصادم ہوا جس کے نتیجے میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ اسی طرح نواں کوٹ کے نواح میں ایک زمین کے تنازعہ کی بنیاد پر دو زمینداروں کے جھگڑے میں کھیت پر کام کرتے ہوئے ہاریوں پر بندوقوں سے حملہ کیا گیا جس میں دو ہاری ہلاک اور دوسری طرف سے ایک عورت بھی مخالف فریق پر کونٹر کیس کرنے کے لئے ہلاک کی گئی جب کہ دیگر کئی ہاری جن میں ان کی عورتیں بھی تھیں زخمی ہوئے۔

سانگھڑ

وڈیروں کی غنڈہ گردی نے
ہاریوں کی زندگی اجیرن کردی

ایاز سندھی

ضلع سانگھڑ کو بے شمار دیہات کا ضلع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، یہ سندھ کا زرخیز اور ہاریوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں پر مشتمل ضلع صدیوں سے مفت خور وڈیروں کی جاگیر ہے اور یہاں ان لوگوں پر جو وڈیروں کے عیش و عشرت کو اپنے خون سے برقرار رکھتے ہیں، کسی دور میں کوئی توجہ نہیں دی گئی اور وہ مفلوک الحال، فاقہ کش، افلاس زدہ آج بھی صدیوں پہلے کی طرح سے زندگی۔ واقعی زندگی کو ترس رہے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ حاکموں نے سندھ مختلف ضلعوں میں "مثالی گاؤں" کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تھا اور اس منصوبے پر عمل بھی کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں زندگی ہمہ ہمی سے لاتعلق گاؤں کے درمیان چند زندگی سے بھرپور دیہات نے سر ابھارا لیکن یہ گاؤں اپنے دامن میں پھول سجانے ہاریوں کے نہیں بلکہ وڈیروں، ان کی محبوباؤں، داشتاؤں ان کے عشرت کدوں کی حفاظت کرنے والے غنڈوں، نوکر شاہی کے راشی افسروں کے رین بسیرے بن گئے۔ ناچ و رنگ، شراب و کباب، بھنگ و چرس کی محفلیں جمنے لگیں اور یہ عیاشی کے اڈے وڈیروں کی دولت کے بل بوتے پر پھیلتے پھولتے رہے۔

اس کے برخلاف ہاریوں کی بستیوں میں آج بھی لوٹ کھسوٹ کا راج ہے۔ غربت و افلاس کے ڈیرے ہیں۔ منافع خور دکاندار، سود خور تاجر، وڈیروں کے پالے ہوئے غنڈے کا دستِ عذاب ہر ہاری اور اس کے خاندان کے سر پر مثال موت تنا ہوا ہے، چوری ڈاکے، جھوٹے مقدمات، رشوت، چور بازاری اور زناکاری وڈیروں کے دم سے دن رات ترقی کی طرف محوِ سفر ہیں۔

سینکڑوں بستیوں کی بات کرنے اور ان کا اصل احوال تحریر کرنے کی نہ ہم میں سکت ہے اور نہ آپ میں پڑھنے کی طاقت۔ آئیے ہم آپ کو اپنے گاؤں نذر علی نظامی لئے چلتے ہیں۔ وہ دیکھئے گرد و غبار کے ریلے آسمان کی سمت پرواز کر رہے ہیں۔ نیچے دیکھ کر چلئے کچی اور کھڈوں سے اٹی ہوئی سڑکیں آپ کے پیروں سے نہ لپٹ جائیں۔ جلدی چلئے اندھیرا پھیلنے والا ہے اور یہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں لوگ صدیوں سے دیئے جلا رہے ہیں اور رات صدیوں سے ان کا مذاق اڑا رہی ہے۔ نہیں نہیں اس طرح سر کو جھکا کر اندر چلئے یہ جھونپڑی کا دروازہ نما سوراخ ہے آپ کی پیشانی میں گھاس کے تنکے پیوست ہو جائیں گے۔ سگریٹ بجھا کر پھینکئے آگ لگ جائے گی۔ نہیں بھوت نہیں یہ ایک قریب المرگ مریض کا واویلا ہے۔ دوا — ! یہ کیا کہہ دیا آپ نے یہاں دوا اور علاج سے ہر شخص ناواقف ہے کسی سے تذکرہ بھی مت کیجئے لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ دوا۔ علاج ڈاکٹر کا یہاں کیا کام۔ یہاں تو جھونپڑی میں ایک نیم حکیم موجود ہے۔ جنگل کی جڑی بوٹیاں صدیوں سے ان گاؤں والوں کی صحت کی ضامن ہیں۔ صحت میں نے غلط کہہ دیا۔ صحت نہیں زندگی۔ رینگنے والی زندگی، دوسروں۔ وڈیروں کو آسائش مہیا کرنے اور خود قبر کی طرف سفر کرنے والی زندگی۔ مچھر، جراثیم، بیماریاں، گندگی یہ سب اس گاؤں کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ ان کا نام عزت و توقیر سے لیجئے ورنہ لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ آپ تو بڑے بے صبرے ہیں جائیے اپنے شہر کی طرف یہاں آپ نہیں رہ سکتے۔ یہاں رہنے کے لئے صبر ایوب درکار ہے۔ ورنہ آپ زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔

حکمران طبقات کی دھینگا مشتی عوام سے قربانیاں مانگ رہی ہے

مزدور کسان پارٹی مکمل صوبائی خود مختاری کی حامی ہے

دوست محمد بھچر سے انٹرویو

روشن ملک

دوست محمد بھچر پاکستان مزدور کسان پارٹی کے رہنما ہیں۔ انہوں نے "ہل" چھوڑ سیاست میں قدم رکھا کیونکہ جاگیرداروں نے کاشتکاری کے لیے زمین دینے سے انکار کر دیا تھا اور بھچر نے اپنا بیلوں کا جوڑا جس میں ایک گائے اور دوسرا بیل جوتتے تھے بیل فروخت کر کے جاگیرداری نظام کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا تھا۔

روشن: بھچر صاحب حکمرانوں طبقات کے درمیان جو کش مکش ہو رہی ہے اسے آپ کیسے دیکھتے ہیں اور یہ دھینگا مشتی کب تک رہے گی؟

بھچر: گزشتہ ایک سال سے پاکستان ایک زبردست سیاسی طوفان کی زد میں ہے۔ جو کہ ہماری تاریخ میں ایک بے نظیر دور ہے اور مارشل لا کے باوجود آج بھی اس رو میں زور ہے۔ جہاں تک محنت کش عوام کا تعلق ہے ہر ایک حکومت ایک ہی قسم کے عزائم سے اسے اپنی غلامی میں رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دھینگا مشتی عوام کی جدوجہد سے ختم ہو گی جو کہ قربانی مانگتی ہے۔ یہ جدوجہد سات کروڑ عوام کی ہو گی۔ یہ محنت کشوں کی جدوجہد ہو گی اور محنت کشوں کی راہنمائی میں کی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں ایک نیا آزاد خوشحال اور جمہوری پاکستان ابھرے گا جو کہ افسر شاہی کا نہیں بلکہ عوام کا پاکستان ہو گا۔ جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا استحصال کرے گا اور نہ ہی کوئی صوبہ یا قومیت کسی دوسرے صوبے یا قومیت کا استحصال کرے گی۔ بائیں بازو کے لوگوں کے لیے یہ نہایت موزوں وقت ہے کہ وہ مل کر اس جدوجہد کی رہنمائی کریں اور سیاست معیشت اور ثقافت تینوں محاذوں پر ہونا ہے۔

روشن: کیا آپ کی پارٹی اس سلسلہ میں کوئی ملک گیر تحریک چلانے کا ارادہ رکھتی ہے؟

بھچر: ہماری پارٹی کسی قسم کی ملک گیر تحریک چلانے کا ارادہ نہیں رکھتی مگر اس تپش میں بائیں بازو کے اتحاد کو قائم کرنے اور پختہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ملک میں جو تپش جاری ہے اس میں ہمارا فرض ہے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اور اس کا نام پاکستان ہے۔ اس کو استحصالیوں، لٹیروں سے پاک کیا جائے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کی بقا ممکن ہو اور اسی وجہ سے ہم اپنے ملک کو اس گرداب سے نکالنے کے لیے کوشاں ہیں۔

روشن: حکمرانوں طبقوں کا کسانوں، مزدوروں، عام شہریوں اور صحافیوں پر جو تشدد روز بروز بڑھ رہا ہے اس کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

بھچر: ملتان میں مزدوروں پر وحشیانہ گولیوں کی بارش کی گئی۔ اس سے پہلے بلوچستان میں پٹ فیڈر کے علاقے میں اس قسم کا بہیمانہ تشدد کسانوں سے ہو چکا ہے۔ صوبہ سرحد میں مہوڈھیری کا بستا بستا گاؤں اجاڑ دیا گیا ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں دو ممتاز صحافیوں محمود شام اور احسان بلگرامی پر اسلامی جمعیت طلبا نے تشدد کیا پھر حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک طالب علم تنظیم کے سربراہ پرویز عنایت ملک پر اسی قماش کے غنڈوں نے تشدد کیا اور اس قسم کے مزید تشدد کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ دراصل اس لیے کیا جا رہا ہے کہ حکمرانوں کے مفاد میں وضع کیے گئے جاگیرداری ضابطوں کو "نظام مصطفےٰ" کے مقدس اور دل پذیر لیبل میں لپیٹ کر لاگو کیا جائے۔

روشن: بھٹو ازم کے بارے بڑے زور شور سے پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ اسے ختم کیا جائے کیا آپ بتائیں گے کہ حکمران کونسا بھٹو ازم ختم کرنا چاہتے ہیں؟

بھچر: بھٹو ازم کے دو حصے ہیں ایک وہ جس سے بھٹو نے ۱۹۷۰ء کا الیکشن جیتا تھا دوسرا وہ جس کا نام جس میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جس میں جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ بالفاظ دیگر حکمران طبقات تاریخ کو پیچھے کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔ جس میں انہیں ناکامی رہے گی۔

"میری کرسی مضبوط ہے" بھٹو کی پالیسیاں بھی بڑی دلچسپ تھیں۔ موجودہ حکمران بھی اس بھٹو ازم کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کو بھٹو خود ختم کرنا چاہتا تھا اور سات سال میں ختم نہ کر سکا جو نعرہ عوام میں بھٹو نے چلائی تھی" طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" "سوشلزم ہماری معیشت ہے"۔ دوسرا بھٹو ازم "میری کرسی مضبوط ہے" جو موجودہ حکمرانوں کو بھی عزیز ہے۔ دراصل پی این اے اور حکمران طبقات اس بھٹو ازم کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں جس میں سوشلزم کا نام آتا ہے۔

روشن: کیا مزدور کسان پارٹی مکمل خود مختاری کی حامی ہے؟

بھچر: مزدور کسان پارٹی مکمل صوبائی خود مختاری کی حامی ہے اور ون یونٹ بنانے کی تمام کوششوں کی مذمت کرتی ہے۔ کیونکہ ہر غلط عمل اس کے ردعمل کو جنم دیتا ہے۔ ایوب شاہی دور میں حکومتی مرکزیت نے چھ نکات اور بالآخر بنگلہ دیش کو جنم دیا۔ پاکستان کے استحکام اور اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہاں کوئی بندہ دوسرے بندے کا باجگزار نہ ہو اور یہاں کسی صوبے کی دوسرے صوبے پر بالادستی نہ ہو۔ بلکہ تمام صوبوں کے باشندوں میں برادرانہ جذبہ کارفرما ہو اور ملک کے پسماندہ علاقوں کی ترقی میں ترجیحی سلوک روا رکھا جائے۔

تین ماہ کے عرصے میں بلوچستان کے طلبا پر تین مرتبہ فائرنگ کی گئی

توصیف احمد

بلوچستان کے عوام نے ہر دور میں حق و صداقت کا علم بلند کیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد ہر دور میں بلوچ عوام ظلم و تشدد کے خلاف قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ لیاقت علی کا دور ہو، ایوب خان کا بھٹو حکومت کا یا موجودہ دور ہو بلوچ نوجوانوں نے اپنے خون سے سچائی کے علم کو بلند رکھا ہے۔

فوجی جنتا کے ملک میں قیام اور بلوچستان میں صورت حال کو معمول پر لانے کے بلند و بانگ دعوؤں کے بعد کچھ امید پیدا ہوئی تھی کہ اب بلوچستان کی صورتحال میں کچھ فرق پیدا ہوگا اور وہاں کے عوام سکھ کا سانس لے سکیں گے مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ امید بر نہیں آئے گی۔

پچھلے دو ماہ کے دوران پولیس اور کوسٹ گارڈ نے تین سے زیادہ مرتبہ بلوچ طالب علموں پر گولیاں چلائیں۔ اور بہت سے طالب علموں کو گرفتار کیا۔ سب سے پہلا واقعہ خضدار میں ہوا جہاں پر پہلے تو بلوچستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مرکزی وائس چیئرمین اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا گیا بعد میں جب طلبا نے ان کی رہائی کا مطالبہ کیا تو ان نہتے طلبا پر پولیس نے گولی چلادی اس فائرنگ میں دو افراد ہلاک اور دس سے زیادہ افراد زخمی ہوئے تھے۔ اس فائرنگ کے بعد مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اعلان کیا تھا کہ اس واقعے کی مکمل تحقیقات کرائی جائے گی اور مجرموں کو سزا واقعی دی جائے گی۔ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ تمام گرفتار شدگان طلبا کو رہا کر دیا جائے گا۔ ابھی اس وعدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پولیس اور کوسٹ گارڈ نے بلوچستان کے جنوبی علاقوں میں دہشت گردی کی کارروائیاں شروع کر دیں۔ پچھلے ہفتے ایران کی سرحد سے متصل سیدی گاؤں مند میں ایک گھر میں قانون کے دو محافظ گھس گئے اور انہوں نے مبینہ طور پر ایک عورت کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی عورت کے شور مچانے پر لوگوں جمع ہو گئے اور ان غنڈوں کو پکڑ کر فوجی انتظامیہ کے حوالے کر دیا۔

اس غیر انسانی و غیر اخلاقی عمل کے خلاف مند کے طلبا اور عوام نے سخت احتجاج کیا اور مجرموں کو سزا دلوانے کے لئے ایک پر امن مظاہرہ کیا۔ ان مظاہرین پر پولیس اور کوسٹ گارڈ نے گولی چلادی جس سے کئی طالب علم شدید زخمی ہوئے۔

اس کے بعد ۱۶ مئی کو پنجگور میں کوسٹ گارڈ نے دو افراد پر گولی چلادی اس فائرنگ میں ایک شخص موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔

جب ان واقعات کی اطلاع مکران ضلع کے دارالحکومت تربت میں پہنچی تو طلبا اور نوجوان نے شدید احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں تربت کالج میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس میں طلبا نے عوام پر ظلم و تشدد کی سخت مذمت کی جلسے میں مطالبہ کیا گیا کہ ان واقعات کی فوراً تحقیقات کروائی جائے اور مجرموں کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی سرکاری اداروں سے ہو بر سر عام سزا دی جائے۔ اس احتجاجی جلسے کے بعد طلبا نے ایک پُرامن جلوس نکالا ابھی جلوس کچھ قدم ہی چلا تھا کہ مکران اسکاؤٹس کے ایک دستے نے بغیر وارننگ دیئے جلوس پر گولی چلادی۔ اس فائرنگ سے کئی افراد ہلاک اور بہت سے شدید زخمی ہوئے۔ خود حکومت نے اپنے پریس نوٹ میں آٹھ طلبا کے شدید زخمی ہونے کا اقرار کیا ہے

اس مہینے صرف یہ تین وارداتیں ہی نہیں ہوئیں جن میں پولیس مکران اسکاؤٹس اور کوسٹ گارڈ نے تشدد کی کارروائیاں کی ہوں بلکہ مکران اسکاؤٹس نے مکران ضلع میں متعدد مقامات پر مختلف گاؤں پر چھاپے مارے اور مبینہ طور پر گاؤں والوں کے مال و اسباب لوٹ کر لے گئے۔

غرض کہ پورے مکران ضلع میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہوگیا ہے لوگ اپنے گھروں میں بھی اپنے آپکو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ بلوچستان میں طلبا اور نوجوانوں پر تشدد کے خلاف کوئٹہ اور کراچی میں دو جلسے منعقد ہوئے۔ بی ایس او عوامی گروپ کی طرف سے ہونے والے جلسے میں پروگریسو فرنٹ اور جیے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے شرکت کی ایک اور جلسے میں لبرل اسٹوڈنٹس پختون اسٹوڈنٹس پروگریسو فرنٹ اور بی ایس او نے شرکت کی ان جلسوں میں مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان سے فوجوں کو ۱۹۷۲ کی پوزیشنوں پر واپس لایا جائے۔ نہتے طلبا پر فائرنگ کرنے والوں کو بر سر عام سزا دی جائے۔ بلوچستان میں دہشت گردی کا ماحول ختم کرنے کے لئے تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے پورے ملک میں اخبارات پر عائد پابندیوں کو ختم کیا جائے۔

الف لیلیٰ کی لمبی کہانی

فضل علی نے پہلی مرتبہ

عدالت میں کہی!

بقیہ صفحہ ۔۔ سے آگے

اس اصلاح کا بھی ان کا بیان زیر دفعہ ۱۶۱ یا ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری میں سے کسی میں کوئی ذکر نہیں مگر سامع بنچ نے اُسے بھی فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۸ میں اپیل کنندے کے خلاف استعمال کیا ہے۔

(چہاردہم) گواہ استغاثہ نمبر ۲۰ امیر بادشاہ اپنی شہادت کے صفحہ ۴۵۶ میں کہتے ہیں:۔

میاں عباس نے مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا تھا کہ غلام مصطفےٰ کو فراہم کئے جانے والے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی ایک رسید لے لوں اور رجسٹر میں ان کا اندراج نہ کروں۔"

انہوں نے اس قدر اہم بات کا کوئی تذکرہ نہ تو اپنے زیر دفعہ نمبر ۱۶۱ ضابطہ فوجداری نہ ہی زیر دفعہ ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری کے بیان میں کہا گیا تھا سامع بنچ نے ان اصلاحات کو اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیرا نمبر ۱۹۲ اور نمبر ۴۶۹ میں استعمال کیا ہے۔

(پنجدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۲۴ افضل علی اپنی شہادت کے صفحہ نمبر ۴۸۹ میں لکھتے ہیں۔

اوائل اگست ۱۹۷۴ء میں ایف ایس ایف کا انسپکٹر غلام حسین، ڈائریکٹر محمد عباس ایک چٹ لیکر آیا۔ جس میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ ایک اسٹین گن، دو میگزین، ساٹھ راؤنڈ اور ایک پستول غلام حسین انسپکٹر کو خصوصی ڈیوٹی کے لئے دیئے جائیں۔ میں نے ان چیزوں کا اندراج عارضی طور پر دیئے جانے والے ہتھیاروں کے رجسٹر میں کرنا چاہا۔ لیکن غلام حسین نے کہا کہ ڈائریکٹر محمد عباس نے یہ حکم دیا ہے کہ یہ اسلحہ اور گولہ بارود غلام حسین کی دی ہوئی ایک کچی رسید پر دے دیئے جائیں۔ اور جب یہ اسلحہ اور گولہ بارود واپس کئے جائیں گے اس وقت غلام حسین وہ رسید واپس لے لے گا۔ اور یہ کہ ان ہتھیاروں اور گولہ بارود کا اندراج رجسٹر میں نہیں ہوگا۔ میں نے اُسے یہ اسلحہ اور گولہ بارود جاریہ احکامات کے تحت دینے سے انکار کردیا لیکن غلام حسین نہ مانا۔ غلام حسین انسپکٹر خفا ہوکر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر مجھ سے بولا کہ ڈائریکٹر میاں محمد عباس نے تمہیں طلب کیا ہے میں اس کے ساتھ میاں محمد عباس کے پاس گیا میں جوں ہی ڈائریکٹر میاں محمد عباس کے دفتر کے کمرے میں داخل ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے میرا حکم کیوں نہیں مانا۔ میں نے کہا کہ چونکہ وہ حکم جاریہ احکامات کے مطابق نہیں تھا اس لئے میں نے اسلحہ اور گولہ بارود نہیں دیئے ڈائریکٹر چیخ کر کہنے لگا کیا تم اب نوکری کرنا نہیں چاہتے۔ میں تمہیں ملازمت سے نکال دوں گا اور تم اپنے گھر بھی واپس پہنچ سکو گے۔ اس نے مجھے پھر حکم دیا کہ فی الفور وہ اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرو ورنہ تمہاری ملازمت ختم کردی جائے گی۔ تب میں نے غلام حسین کی دی ہوئی رسید پر وہ اسلحہ اور گولہ بارود دے دیئے۔"

الف لیلیٰ کی یہ لمبی کہانی فضل علی نے پہلی مرتبہ کورٹ میں کہی لیکن ضابطۂ فوجداری کی دفعہ نمبر ۱۶۱ کے تحت اس نے پہلے جو بیان دیا تھا۔ اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ بعد کی گھڑی ہوئی کہانی وعدہ معاف گواہ غلام حسین کی اصلاح شدہ کہانی کی تائید کے لئے تھی ایک دوسرے جھوٹ کی تائید کرنے کے لئے یہ دوسرا جھوٹ تیار کرنا پڑا تھا۔ انہیں حقائق کی بنیاد پر سماعت کرنے والی بنچ نے ملزم میاں محمد عباس سے سوالات نمبر ۱۶ اور نمبر ۱۷ پوچھے تھے اور اپیل کنندے کو نقصان پہنچانے کے لئے فیصلے کے پیرا نمبر ۱۸۲، نمبر ۱۸۶، نمبر ۴۱۶، نمبر ۴۲۹، نمبر ۴۳۲، نمبر ۴۴۴، نمبر ۴۴۲ اور نمبر ۴۸ میں استعمال کئے تھے۔

(شش دہم) گواہ نمبر ۲۴ فضل علی نے اپنی شہادت کا صفحہ ۴۹۱ پر کہا۔

"اسی ماہ کے اختتام سے دو دن پہلے غلام حسین انسپکٹر نے سارے ہتھیار اور گولہ بارود واپس کر دیئے"

اس نے دفعہ ۱۶۱ ضوابط فوجداری کے تحت جو بیان دیا تھا اس میں یہ نہیں کہا تھا۔ سامع بنچ نے اپنے اخذ کردہ نتائج کی تائید میں اُسے استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو پیرا نمبر ۱۳۰، نمبر ۱۸۷، نمبر ۴۱۶، نمبر ۴۲۹، نمبر ۴۴۴، نمبر ۴۴۸ اور نمبر ۴۸۸۔ ملزم میاں عباس سے سوال نمبر ۲۵ اسی اصلاح کی بنیاد پر پوچھا گیا تھا۔

(ہفدہم) پھر یہی گواہ فضل علی شہادت کے صفحہ نمبر ۴۹۱ میں کہتے ہیں۔

"۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء سے دو یا تین دن پہلے غلام حسین انسپکٹر انچارج کمانڈو کورس میرے پاس وہ گولہ بارود واپس کرنے آیا۔ جو اسے ۹ مئی ۱۹۷۴ء کو دیئے گئے تھے۔ جب میں نے استعمال شدہ گولہ بارود کا جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ پچاس سے اکیاون تک ایس ایم جی کے خول کم تھے۔ نتیجتہً میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں ان کے لائے ہوئے گولہ بارود اسی صورت میں قبول کروں گا جب کہ وہ ان گم شدہ خولوں کے کیسوں کا حساب دیں۔ لہٰذا وہ اسے واپس لے گئے پھر وہ ۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء کو ان گولے بارود کے ساتھ واپس آئے۔ میں نے ان کا پھر جائزہ لیا اور دیکھا کہ انہیں صحیح تعداد میں واپس کیا جا رہا ہے"۔

یہ خیالات مابعد پر مبنی کہانی انہوں نے پہلی مرتبہ عدالت میں سنائی اس کا کوئی ذکر ان کے اس بیان میں نہیں تھا جو انہوں نے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت دیا تھا یہ کہانی وعدہ معاف گواہ غلام حسین گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ کے اصلاح شدہ متن کی تائید میں بیان کی گئی تاکہ اس دستاویز کو غلط ثابت کیا جاسکے۔ جس سے پشاور میں اس کی موجودگی ثابت ہوتی تھی سامع بنچ نے اس کہانی کی بنیاد پر سوال نمبر ۵۶ ترتیب دیا۔ اور میاں عباس سے پوچھا اس اصلاح کو فیصلے کے پیرا نمبر ۱۸۸۔ اور نمبر ۴۱۳ میں قابل غور سمجھا گیا جس سے

اپیل کنندے کو نقصان پہنچا۔

(ہیژدہم) گواہ استغاثہ فضل علی نے اپنی شہادت کے صفحہ ۴۹۲ میں کہا۔

"خولوں کے ۴۰ یا ۵۰ بکس اسلحہ خانے میں جمع ہو جانے پر انہیں واہ فیکٹری بھیج دیا جاتا ہے غلام حسین کے ۱۵۰۰ فائر کئے ہوئے راؤنڈ جمع کرانے سے آٹھ دس دن بیشتر مجھے میاں عباس نے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ میاں عباس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اسلحہ خانے میں فائر کئے ہوئے کارتوس ہوں گے میں نے ان سے کہا کہ تمام ہتھیاروں کے فائر کئے ہوئے کارتوس اسلحہ خانے میں پڑے ہوتے ہیں۔ میرا جواب سن کر میاں عباس نے مجھ سے ایس ایم جی، ایل ایم جی کے ۲۵۔۳۰ فائر کئے ہوئے کارتوس لانے کو کہا۔ میں اسلحہ خانے میں واپس گیا اور ایس ایم جی، ایل ایل جی کے تیس خول ڈائریکٹر کے پاس لے گیا ڈائریکٹر نے مجھے حکم دیا کہ ان خولوں کو ان کی میز پر رکھ دوں اس لئے کہ وہ اس وقت کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے بتائیں گے کہ ان کارتوسوں کو میں کب واپس لے لوں۔ ڈائریکٹر میاں محمد عباس نے ۲ یا ۲/۱ ۲ گھنٹے کے بعد مجھے پھر طلب کیا اور وہ خول واپس لے جانے کے لئے کہا۔ میں نے ان خولوں کو گنا وہ تیس تھے۔ میں نے انہیں لاکر اسلحہ خانے میں دوبارہ جمع کر دیا۔"

یہ بیان استغاثہ کے کیس میں تبدیلی کے باعث دیا گیا کیونکہ بالسٹک ایکسپرٹ کی منفی رپورٹ سے استغاثہ کا کیس خراب ہو گیا تھا۔ اس بیان کا بھی دفعہ ۱۶۱ ضابطہ فوجداری کے تحت دیئے گئے بیان میں کہیں کوئی ذکر نہیں۔ یہ جرائم کے خولوں کی تبدیلی سے متعلق بعد کی کہانی سے مطابقت کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اپیل کنندے سے اس کہانی کی بنیاد پر کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا پھر بھی سامع بنچ نے فیصلے کے پیرا نمبر ۴۷۹ اور ۴۱۳ میں فضل علی کے اس اصلاح شدہ متن پر اعتبار کیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جرم کے خولوں کو ملزم میاں محمد عباس نے تبدیل کر دیا تھا۔ جرم کے خولوں کی اس تبدیلی کو اپیل کنندے کے خلاف بطور ایک شہادت کے قبول کیا گیا جس سے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی شہادت کی تائید اس طور پر ہوئی کہ اپیل کنندے کا ارتکاب جرم سے تعلق قائم ہو گیا۔

(نوزدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ غلام حسین وعدہ معاف گواہ نے اپنی شہادت صفحہ ۵۲۷ میں کہا:

"کاغذات کے اعتبار سے میری تعیناتی بٹالین ۵ میں تھی لیکن میاں محمد عباس نے زبانی طور پر یہ حکم دے دیا تھا کہ میں صدر مقام میں ان کے تحت کام کروں۔"

اس نے ایسا کوئی الزام اپنے دو سابقہ بیانات مؤرخہ ۱۱۔ اگست ۱۹۷۷ء اور ۱۲ اگست ۱۹۷۷ء میں عائد نہیں کیا تھا یہ جھوٹ ایف ایس ایف کے سرکاری ریکارڈ کو باطل کرنے کے لئے گھڑا گیا تھا اور ایسا یہ کیس بنانا مقصود تھا کہ گواہ براہ راست میاں محمد عباس کے تحت کام کر رہا تھا اسی اصلاح کی بنا پر میاں محمد عباس سے سوال نمبر ۵ کیا گیا تھا اور سماعت کرنے والی بنچ نے اپیل کنندے کے خلاف پیرا نمبر ۱۷ میں اس بنا پر اعتبار کیا ہے۔

(بیستم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ غلام حسین نے شہادت کے صفحہ نمبر ۵۲۸ میں کہا:

"کیمپ میں تربیت پانے والے تربیت کی غرض سے اپنی بٹالین سے اپنے لئے اسلحہ لاتے تھے۔ اور ان کے لئے گولہ بارود ایف ایس ایف کے صدر مقام کے اسلحہ خانہ واقع نمبر ۵۷ اے سٹلائٹ ٹاؤن سے حاصل کئے جاتے تھے۔

ان بیانات میں سے کسی کا بھی کوئی ذکر اس کے علاوہ دو سابقہ بیانات میں نہیں تھا۔ سوال نمبر ۸ اسی کی بنیاد پر تیار کیا گیا اور میاں محمد عباس سے پوچھا گیا تھا۔ اس اصلاح کو بھی اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیرا نمبر ۱۱۸ میں استعمال کیا گیا ہے۔

(بیست و یکم) گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین نے اپنی شہادت صفحہ نمبر ۵۳۱ میں میاں محمد عباس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

"اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک چٹ دی اور ہدایت کی کہ صدر مقام اسلحہ خانے کے انچارج فضل علی سے ایک اسٹین گن ایک پستول دو میگزین اور گولہ بارود حاصل کروں میں وہ چٹ فضل علی کے پاس لے گیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس سامان کے دینے کا اندراج رجسٹر میں نہ کرے کیونکہ میاں محمد عباس کا یہی حکم ہے بلکہ یہ سامان ایک رسید کی بنیاد پر دے۔ جو میں اسے دینے والا تھا۔ فضل علی نے اصرار کیا کہ وہ یہ سامان اسی صورت میں دے گا جب کہ رجسٹر میں اس کا اندراج ہو۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ میں میاں محمد عباس کی ایک چٹ لیکر آیا ہوں اور میں یہ سامان ان کے دیئے ہوئے حکم کے بموجب طلب کر رہا ہوں لیکن اس نے چونکہ دینے سے انکار کیا اس لئے میں وہ چٹ لے کر میاں محمد عباس کے پاس لوٹ آیا۔ میں نے انہیں چٹ واپس دیتے ہوئے کہا کہ فضل علی کوئی سامان پہلے رجسٹر میں درج کئے بغیر دینے کو تیار نہیں۔ میاں صاحب نے مجھے فضل علی کو لانے کا حکم دیا۔ اس حکم کے مطابق میں فضل علی کو میاں صاحب کے دفتر میں لے گیا میاں صاحب نے اس کے سامنے وہ حکم دہرایا اور کہا کہ اگر اس نے رجسٹر میں اندراج کئے بغیر مطلوبہ اسلحہ اور گولہ بارود دینے کے متعلق ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو اسے نہ صرف اپنی ملازمت سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بلکہ وہ (میاں صاحب) اس سے بری طرح پیش آئیں گے۔ یہ سن کر فضل علی ان کے حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گیا اور وہ اور میں دونوں اسلحہ خانہ چلے گئے اسلحہ خانہ پہنچ کر فضل علی نے ایک اسٹین گن، دو میگزین، ایک پستول اور دونوں کے لیے گولہ بارود میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے اسے ایک رسید دے دی اور میں یہ چیزیں اپنے کمانڈو کیمپ لے گیا۔"

اس طرح اسلحہ اور گولہ بارود دینے کے قائم شدہ طریقے یعنی اس مقصد کے لیے موجودہ رجسٹر میں اندراج کے بعد دینے کے طریقے کی نفی کرنے کے علاوہ وعدہ معاف گواہ غلام حسین

نے عدالت میں پہلی مرتبہ اس وقت کہی جب اس واقعے کو
تین سال گزر چکے تھے اور اس کے سابقہ بیانات میں اس کا
کوئی ذکر تک نہیں تھا۔ سوال نمبر ۱۶ اور ۱۷ اسی کہانی کی بنیاد
پر تیار کیے گئے تھے جو میاں محمد عباس سے پوچھے گئے۔ سماعت
کرنے والی بینچ نے پیرا ۱۲۳، ۴۲۹، ۴۳۲، ۴۴۲
اور ۴۸۴ میں انہیں اپیل کنندے کو مجرم قرار دینے
کے لیے بطور ایک شہادت کے تسلیم کیا ہے۔

بیست و دوم

غلام حسین گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ نے صفحہ ۵۳۷ میں کہا ہے:
میاں عباس نے مجھے حکم دیا کہ کمانڈو کیمپ کے
کانسٹیبل ظہیر اور ریاقت کو لاہور جانا اور مسٹر احمد رضا
قصوری کو تلاش کرنے پر مامور کروں۔ میں نے حکم
کی تعمیل کی۔ میں کمانڈو کیمپ میں اپنے کام پر مامور ہو گیا۔"

یہ بھی اس نے اپنے دو بیانات میں سے کسی میں نہیں
کہا تھا تاہم سوال نمبر ۲۶ کی تشکیل اسی کی بنیاد پر ہوئی اور
میاں عباس سے پوچھا گیا۔ فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۳۷ اور
۴۸۷ میں اسی بیان پر بھروسہ کرتے ہوئے اپیل کنندے کو
ملوث کیا گیا ہے۔

بیست و سوم

گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے
صفحہ ۵۳۸ میں اپنی شہادت میں کہا:

"میاں محمد عباس نے اکتوبر ۱۹۷۴ء میں عید
سے ایک دن پہلے مجھے بلوا بھیجا۔ انہوں نے مجھ
سے کہا کہ میرے جو آدمی لاہور بھیجے گئے تھے وہ
چھٹیاں منا رہے ہیں۔ کچھ کیا نہیں ہے۔ انہوں
نے یہ بھی کہا کہ تم چونکہ راولپنڈی میں ٹھہرے ہوتے
ہو اور کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے
اس وقت کے وزیر اعظم نہیں گالیاں دے رہے
ہیں۔ میں نے کہا کہ میں عید کے بعد فوراً لاہور روانہ
ہو جاؤں گا۔ تاہم انہوں نے مجھے ہدایت دی کہ
فی الفور روانہ ہو جاؤں اور لاہور پہنچ کر انہیں ٹیلیفون
کے ذریعہ مطلع کروں کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے
مجھ سے یہ بھی کہا کہ عید ہی بہترین موقعہ ہے جبکہ میں
مسٹر احمد رضا قصوری سے نمٹ سکتا ہوں۔ وہ اس
موقعے پر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے
ملانے میں مصروف ہوں گے۔ میں نے بٹالین نمبر ۲
کے روزنامچے میں اپنی روانگی درج کی اور لاہور روانہ
ہو گیا۔ وہاں سے میاں محمد عباس کی ہدایت کے مطابق
میں نے انہیں فون کیا اور اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔
میرے واقعی لاہور پہنچنے کی تصدیق کرنے کے لیے
میاں محمد عباس نے مجھے ایف ایس ایف ہیڈ کوارٹر
شاہ جمال میں فون کیا اور مجھ سے باتیں کیں۔
"میں تقریباً دس دن لاہور میں ٹھہرا اور مسٹر
احمد رضا قصوری کے کوائف معلوم کرنے کے بعد میں
راولپنڈی واپس چلا آیا جہاں میں نے بٹالین نمبر ۲
کے روزنامچے میں اپنی واپسی درج کی۔"

یہ ملوث کرنے والی کہانی اس نے اپنے سابقہ بیانات
میں سے کسی میں بھی نہیں سنائی تھی۔ سماعت کرنے والی بینچ
نے اس کہانی پر بھی فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۳۷ اور ۴۸۷
میں اعتبار کیا ہے۔ اسی بیان کی بنیاد پر سوال نمبر ۳۱ مرتب
کیا گیا اور اپیل کنندے سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری
پوچھا گیا۔

بیست و چہارم

مزید براں، گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین نے صفحہ ۵۴۳
میں کہا۔

"۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو رات ۷ اور ۸ بجے
کے درمیان میں نے صوفی غلام مصطفےٰ سے کہا کہ ہمیں
احمد رضا قصوری کا پتا لگانے کی کوشش اسی دن
کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم کچھ نتائج دکھا سکیں۔ اس کے
بعد غلام مصطفےٰ، افتخار، ارشد اقبال اور میں چاروں
ایک جیپ پر سوار ہو کر ماڈل ٹاؤن کی طرف چلے گئے۔
ہم نے مسٹر احمد رضا قصوری کی کار کو اس جگہ دیکھا
جہاں ماڈل ٹاؤن شاخوں کا مین روڈ فیروز پور روڈ
سے جدا ہوتا ہے۔ ان کی کار فیروز پور روڈ کی طرف
جا رہی تھی جبکہ ہم ماڈل ٹاؤن کی طرف گھوم رہے تھے۔
ہم اس کا تعاقب کرنے کے لیے جیپ کو گھما نہیں
سکے اس لیے ہم سیدھے ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو گئے
ہم اس روڈ کی طرف مڑ گئے جو احمد رضا قصوری کے
گھر کی طرف جاتا تھا لیکن احمد رضا قصوری کے گھر تک
پہنچنے سے پہلے ہم دائیں کو مڑ گئے اس کے بعد فیروز پور
روڈ پہنچ گئے لیکن ہمیں احمد رضا قصوری کی کار دوبارہ
نہیں ملی۔"

گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانات میں یہ کہانی نہیں سنائی
تھی۔ اس کہانی کی بنیاد پر سماعت کرنے والی بینچ نے نہ تو
اپیل کنندے سے نہ ہی میاں عباس سے کوئی سوال کیا لیکن
اسے اپیل کے خلاف فیصلے کے پیرا ۴۴۲ میں استعمال کیا ہے۔

بیست و پنجم

گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین شہادت کے صفحہ ۵۴۴
میں کہتا ہے۔

"ہم وہاں سے فیروز پور روڈ پہنچے اور اگر
میری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو ہم اچھرہ میں ایک
پیالی چائے پینے کے لیے رک گئے اور اپنے دفتر
شاہ جمال کو لوٹ آئے۔ ہم نے جیپ وہیں چھوڑ دی۔
اور ڈرائیور کو چھوڑ کر ہم چاروں اوپر چلے گئے جہاں
ہم رہتے تھے۔ ہم نے صلاح مشورہ کیا۔ چونکہ ہم
جانتے تھے کہ ان کی کار وہاں ہے اور وہ بھی وہیں
ہیں۔ ہم کوئی ایسی جگہ منتخب کرنے کا منصوبہ بنانے
گئے جہاں انہیں قتل کیا جا سکے۔ ہم نے اس جگہ کا انتخاب
کیا جو اگر اس مکان کی طرف رخ کر کے کوئی کھڑا ہو جہاں
شادی ہو رہی تھی تو دائیں موڑ کی طرف پڑتی ہے۔"

اس کہانی کا بھی استغاثہ کے ممتاز وعدہ معاف گواہ کے
دو سابقہ بیانات میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ سماعت کرنے والی
بینچ نے اسے بھی ایک ٹھوس گواہی کی حیثیت دی اور اسی کی
بنیاد پر سوال نمبر ۳۰ تیار کر کے میاں محمد عباس سے پوچھا۔ فیصلے
کے پیرا نمبر ۱۴۵ میں اسی پر اعتبار کیا گیا ہے۔

بیست و ششم

گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین اپنی شہادت کے صفحہ
نمبر ۵۴۶ میں کہتا ہے!۔

"افتخار کو حکم دیا گیا کہ ارشد اقبال کی ہوائی فائر کے
بعد جو پہلی کار اس کے سامنے آئے اس پر گولی چلائے۔
میں نے ارشد اقبال کو ایک سے زائد وجوہ کی بنا پر
ہوائی فائر کرنے کی ہدایت دی تھی۔ وہ شامیانہ کے
سامنے تھے۔ اگر وہ گولی چلاتے تو اس صورت میں
شامیانہ کے اندر لوگوں کو لگ سکتی تھی۔ دوسرے جو
لوگ کاروں کے اندر بیٹھے یا راستے پر چل پھر
رہے تھے ان کے زخمی ہو جانے کا خطرہ تھا۔
تیسرے شادی کی جگہ سے آنے والی کاروں کو
افتخار چونکہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ہوائی فائر
اس کے لیے ایک خبرداری تھی۔"

اس حقیقت سے قطع نظر کہ سامع بینچ نے اسی بیان
کے پیش نظر اپیل کنندے کو ضابطہ تعزیرات پاکستان

کی دفعہ ۱۱۱ کے تحت مجرم قرار دیا ہے جو وہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان اصلاحات کا جن میں افتخار کو ہوائی فائر کرنے کا حکم دینے کے اسباب بتائے گئے ہیں۔ گواہ کے سابقہ دو بیانات میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے سابقہ بیان مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۷۷ء میں اس نے کہا تھا کہ میں نے ارشد اقبال کو ہوائی فائر کرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ مسٹر قصوری کو کوئی زخم نہ لگے۔ پھر بھی سامع بنچ نے اسے ایک ٹھوس شہادت قرار دیا ہے اور اسے فیصلے کے پیراگراف ۱۴۷ اور ۴۰۵ میں اپیل کنندے کے خلاف استعمال کیا ہے۔

بیست و ہفتم

پھر گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین اپنی شہادت کے صفحات ۵۴۶ اور ۵۴۷ میں کہتا ہے:

"میں موٹر پر متعدد بار آیا تاکہ ارشد اقبال اور افتخار پر نظر رکھوں اور یہ بھی معلوم کروں کہ آیا لوگوں نے اس جگہ سے جانا شروع کیا ہے یا نہیں جہاں شادی ہو رہی تھی۔"

گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانات میں یہ بات بھی نہیں کہی تھی لیکن سامع بنچ نے فیصلے کے پیراگراف ۱۴۸ میں اس پر بھی اعتبار کیا ہے۔

بیست و ہشتم

گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین نے شہادت کے صفحہ ۵۵۱ میں کہا:۔

"میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کوئی ایسی چیز تو جائے وقوع پر نہیں چھوڑی ہے جس سے اس واقعہ میں ایف ایس ایف کا ملوث ہونا ظاہر ہو۔ میں نے کہا کہ استعمال شدہ گولیاں وہیں رہ گئی ہیں۔ کیونکہ تاریکی اور گھاس کی وجہ سے وہ ہمیں نہ مل سکیں۔"

یہ اس نے اپنے سابقہ دو بیانات میں نہیں کہا تھا۔ یہ اصلاح شدہ بیان پہلی مرتبہ عدالت میں دیا گیا تاکہ میاں عباس کے ذریعہ (گولیوں کی) تبدیلی کے نظریہ کی تائید ہو سکے۔ سامع بنچ نے پیرا ۱۵۴ میں اسے بطور شہادت کے استعمال کیا ہے اور میاں عباس سے کیا جانے والا سوال ۵۵ اسی کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔

بیست و نہم

گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین نے شہادت کے صفحات ۵۵۱ اور ۵۵۲ میں کہا:

"جب میں نے کیمپ ختم کر دیا تو میں نے کیمپ کے بقیہ گولہ بارود جو استعمال شدہ تھے یا غیر استعمال شدہ سب افضل علی ایس آئی کو واپس کر دیا۔ میں نے ایک روڈ سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر انہیں واپس کیا۔ میرے پاس ۱۵ خول کم تھے جن میں۔ ۳ وہ تھے جو لاہور میں اور ۷ وہ تھے جو اسلام آباد میں استعمال کیے گئے تھے۔ اور بقیہ وہ تھے جو تربیت حاصل کرنے والوں نے پریکٹس فائرنگ کے دوران گم کر دیئے تھے اور میں اس سے باخبر تھا۔ بہرحال مجھے امید تھی کہ افضل علی مجھ سے یہ چیزیں واپس لے لے گا اور باہمی اعتماد کی بنا پر چیکنگ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح اس کا پتا نہ لگ سکے گا۔ لیکن اس نے عملاً چیکنگ شروع کر دی اور کمی کا پتا لگ جاتے پر اس نے ۱۵ پیٹیوں کی کمی پوری کیے بغیر ان چیزوں کو وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ کمی اسٹین گن کی خالی پیٹیوں میں تھی اور میں نے سارے معاملے کی رپورٹ میاں محمد عباس کو کر دی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تین چار دنوں کے بعد پھر رپورٹ کرنا اس وقت تک میں اس کمی کو پورا کرنے کا کوئی بندوبست کر لوں گا۔ میں اس گولہ بارود کے ساتھ کمانڈو کیمپ واپس چلا گیا اور تین چار دنوں کے بعد میاں عباس کے پاس واپس گیا۔ انہوں نے مجھے ایک خالی لفافہ دیا جس میں اسٹین گن کی گولیوں کے ۱۵ خالی کیس تھے۔ میں افضل علی کے پاس گیا اور سارے گولہ بارود روڈ سرٹیفکیٹ ایکس پی ڈبلیو ۲۴/۹ کی بنیاد پر واپس کر دیئے جن پر میرے دستخط تھے۔"

یہ ساری کہانی گواہ نے پہلی مرتبہ عدالت میں کہی جس کا اس کے سابقہ بیانات میں کوئی ذکر نہیں۔ سامع بنچ نے اس کہانی پر فیصلے کے پیراگراف ۴۱۳ میں اعتبار کیا ہے تاکہ ٹی اے بل (ایکس پی ڈبلیو ۳۱/۶) کو جس سے ان دنوں غلام حسین کی پشاور میں موجودگی ثابت ہوئی ہے جعلی ثابت کیا جا سکے۔

(س) گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین شہادت کے صفحات ۵۵۵-۵۵۶ میں کہتا ہے:

"روزنامچہ میں اپنی آمد ریکارڈ کرانے کے بعد تیسرے دن میں نے اپنی پشاور روانگی کا ریکارڈ کرایا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میاں عباس نے مجھے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ میں راولپنڈی میں نہیں تھا۔ یہ اندراج روزنامچہ میں ایکس پی ڈبلیو ۳۱/۴ کے تحت درج ہے جس پر میرے مختصر دستخط ہیں۔ یہ اندراج ۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو میری موجودگی میں کیا گیا تھا۔ لیکن میں پشاور گیا نہیں بلکہ روزنامچے میں اس اندراج کے بعد بھی میں راولپنڈی ہی میں رہا اور کمانڈو کیمپ میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔"

صفحہ ۵۵۶ میں وہ یہ بھی کہتا ہے۔

"جن دنوں لاہور میں خصوصی فرائض انجام دیتا رہا ان دنوں کے لیے میں نے اپنے ٹی اے / ڈی اے برائے کراچی کا مطالبہ کیا۔ یہ میاں محمد عباس کے حکم سے کیا تھا۔"

یہ جھوٹے بیانات گواہ نے پہلی مرتبہ عدالت میں دیئے جن کا اس کے سابقہ دو بیانات میں کوئی ذکر نہیں۔ اس اصلاح کا مقصد ظاہر ہے۔ دفاع نے گواہ کا ٹی اے بل طلب کیا تھا تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ واقعہ لاہور کے دوران وہ فی الحقیقت کراچی میں تھا لہٰذا استغاثہ نے یہ جھوٹا اور من گھڑت متن ریکارڈ کرایا تاکہ اس رکاوٹ کو دور کر سکے۔ سامع بنچ نے اس شہادت کو مذکورہ بالا مقصد کے لیے فیصلے کے پیراگراف ۴۱۳ میں کام لیا ہے۔

(ق) مذکورہ بالا چند مثالیں ان فروگذاشت / اصلاحات کی ہیں جو سامع بنچ کی رولنگ کے مطابق ٹھوس نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود انہیں اپیل کنندے کے خلاف بطور ملوث کرنے والی شہادت کے قبول کیا گیا ہے۔ اور اسے مجرم قرار دینے کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ گواہان استغاثہ کے فروگذاشت اور اصلاحات کی یہی مکمل مثالیں نہیں ہیں بلکہ یہی طریق کار استغاثہ کے تقریباً ہر گواہ کے معاملے میں اختیار کیا گیا ہے۔

و:۔ بعض اوقات سماعت کرنے والی بنچ نے اس امر کا تعین بھی خود گواہ پر چھوڑ دیا کہ آیا کوئی فروگذاشت واقعی تضاد کے مترادف ہے یا نہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گواہ کی رائے یہ ہوتی کہ فروگذاشت واقعی تضاد کے مترادف نہیں تو سماعت کرنے والی بنچ نے اس کی بات کو تسلیم کر لیا۔ مثال کے لیے اس معزز عدالت کی توجہ سماعت

کرنے والی بنچ کے حسب ذیل اظہار کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے جو شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۶۵ پر موجود ہے۔

" سوال : میں آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے آپ کی توجہ آپ کے مؤرخہ ۴ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت قلمبند کیے جانے والے بیان کی طرف منعطف کراتا ہوں۔ براہِ مہربانی کیجئے کر آپ نے اس میں ذکر کیا ہے کہ " انہوں نے مجھے جھڑک دیا اور صاف طور پر کہا کہ ایف ایس ایف کو علیحدہ رکھو"!

نوٹ۔ گواہ نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اسے اہم معاملہ سمجھتا ہے۔ اگر فاضل وکیل چاہیں تو اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ آیا وہ اسے ایسا سمجھتا ہے جو سوال پوچھا گیا ہے اس مرحلے پر پیدا نہیں ہوتا)

کیا آپ اس بات کو اہم معاملات میں سے ایک سمجھتے ہیں کہ انہوں (وزیراعظم) نے مجھے طلب کیا اور صاف طور پر کہا کہ " ایف ایس ایف " کو علیحدہ رکھو"۔

جواب " میں نے انہیں لاہور سے واپسی پر وزیراعظم کو مطلع کیا کہ اس قتل میں جو اسلحہ استعمال ہوا ہے وہ ایف ایس ایف کے زیر استعمال ہے اور مجھے ہدایت کی گئی کہ جا دو سیکرٹری دفاع اور بارہ سے اس کی دستیابی کا بندوبست کروں۔ اس حقیقت سے بذاتِ خود ایف ایس ایف کو علیحدہ رکھنے کے مضمرات صاف ظاہر تھے۔ اگر میں نے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اپنے بیان میں " ایف ایس ایف کو علیحدہ رکھو" کے الفاظ کو چھوڑ دیا ہے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بنا بریں میں اس فروگذاشت کو اہم معاملہ نہیں سمجھتا"

یہ شہادت کے ان اہم ترین حصوں میں سے ایک ہے جس پر سماعت کرنے والی بنچ نے اپیل کنندہ کے نام نہاد " بعد کے رویے " کا فیصلہ کرتے وقت غور کیا ہے۔ اور اسے ایسی شہادت کی بنیاد پر منزا دی گئی ہے۔ جو واضح طور پر اضافہ تھا اور اس گواہ کے سابقہ بیانات میں سے کسی میں جس کا وجود نہیں تھا۔ اس معزز عدالت کی توجہ فیصلے کے پیراگراف ۴۹۹ میں بنچ کے حسب ذیل اظہار کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے :-

استغاثے کے گواہ ۳ نے مزید بیان کیا کہ سیکرٹری دفاع کی مذکورہ بالا رپورٹ ملنے پر وہ ششدر رہ گیا۔ جس میں یہ بات ظاہر کی گئی تھی کہ چینی اسلحہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے زیر استعمال تھے جبکہ اسے اصل ملزم سے یہ ہدایات ملی تھیں کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کو علیحدہ رکھا جائے ..."

(۲۲) اسی طرح سماعت کرنے والی بنچ نے معمول کے برخلاف اپیل کنندہ کے حق میں جانے والی ان شہادتوں کو خارج کر دیا جو استغاثے کے مقدمے کی اصل بنیادوں پر ضرب لگاتی تھی۔ مثال کے طور پر دستاویز EXh. PW 3/16-D کے داخل کرنے کی اجازت خود بنچ نے دی تھی جبکہ وکیل استغاثہ یہ کہہ چکے تھے کہ اصل کا پتہ نہیں چل سکا۔ گواہ استغاثہ ۳۔ سعید احمد نے اس دستاویز اور اس پر اپیل کنندہ کی تصدیق کے مستند ہونے کو ثابت کر دیا تھا۔ اس کے بعد بنچ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ دستاویز استغاثے کے مقدمے کے لیے مضر ہے۔ اس نوٹ کا اضافہ کیا کہ یہ دستاویز اس شرط کے ساتھ شامل کی گئی ہے کہ استغاثہ اس پر اعتراض کر سکتا ہے۔ اعتراض کی نوعیت کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس دستاویز کو مسترد کرتے ہوئے سماعت کرنے والی بنچ اپنے فیصلے کے پیراگراف ۴۰۲ میں کہتی ہے :-

" فاضل وکیل سرکار نے EXh. PW 3/16-D کے طور پر فوٹو اسٹیٹ کاپی کو بطور شہادت شامل کرنے پر اعتراض کیا۔ دستاویز کو شہادت میں اسی اعتراض سے مشروط کر کے شامل کیا گیا تھا۔ کیونکہ بیان کیا گیا تھا کہ اس وقت اصل پیش نہیں ہو رہا تھا۔ اس اعتراض کو تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ اصل ملزم کی طرف سے اصل کے گم ہو جانے کو ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ نہ ہی اس نے اصل طلب کیا ہے"۔

اس اعتراض کو کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ سماعت کرنے والی بنچ کا اظہار اس حکم سے متضاد تھا جو اس نے اس دستاویز کو شہادت میں شامل کرتے وقت دیا تھا۔ قانون شہادت کی دفعہ ۶۵ کی ضروریات کی خاطر خواہ تکمیل ہو چکی تھی اور سماعت کرنے والی بنچ نے بڑے غیر منصفانہ طریقے پر اس واقعے کو غلط طور پر بیان کیا کہ اپیل کنندہ نے اصل دستاویز طلب نہیں کی تھی۔ اس معزز عدالت کی توجہ اپیل کنندہ کی مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء جو متفرق درخواستوں کی جلد کے صفحات ۴۶ - ۴۷ پر اور اس درخواست پر سماعت کرنے والی بنچ کے مؤرخہ یکم نومبر ۱۹۷۷ء کے حکم (متفرق احکامات کی جلد کے صفحات ۲۱-۲۲) کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جو سماعت کرنے والی بنچ کے پیراگراف ۴۰۲ میں مذکورہ بالا بیان کی تردید کرتا ہے اور اس کے گہرے تعصب کو ثابت کرتا ہے۔

نیز فیصلے کے پیراگرافوں ۵۶۴ اور ۵۶۵ میں جن کا تعلق اس دستاویز سے ہے جس نے کم از کم اپیل کنندہ کے مقصد اور بعد کے رویے کے سوال پر استغاثے کے مقدمے کو مسمار کر دیا تھا۔ سماعت کرنے والی بنچ نے کسی بنیاد کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا کہ تصدیق جعلی ہے۔ گواہ استغاثہ کی طرف اپیل کنندہ کے رویے سمیت ہر ایک حالت اس تصدیق کے متن کی توثیق کرتی ہے جسے جعلی قرار دیا گیا ہے۔ سماعت کرنے والی بنچ کی طرف سے دیا گیا جواز کہ دستاویز پر اپیل کنندہ کی دو تصدیقات ہیں اور کیونکہ ان میں ایک تصدیق کا نہ تو کوئی فرد مخاطب تھا نہ ہی اسے کسی کی نظر سے گزرنا تھا۔ اس لیے یہ جعلی تھی قابل قبول نہیں۔

(۲۳) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے اس شہادت پر انحصار کیا ہے جو اپیل کنندہ کے خلاف تھی اور جسے خود اس بنچ نے ناقابل قبول قرار دیا تھا۔ مثال کے طور پر استغاثے کے گواہ ۳۶ نے خولوں کے پیندوں پر نشانات سے متعلق اپنے بیان کے دوران کہا (صفحہ ۶۵۹) کہ :-

" میں نے ان ۲۴ خولوں کے پیندوں کو دیکھا ہے۔ اور پتہ چلایا ہے کہ ان میں سے ۲۲ پر ایک بنچ کے نشانات ہیں۔ اور بقیہ دو پر ۲۲ کے مقابلے میں مختلف بنچ کے نشانات ہیں۔ ۲۲ خولوں کے پیندوں پر جو کندہ ہے وہ ۷۱/۶۶ ہے مگر کمزور نگاہ والے اور قریب سے معائنہ نہ کرنے والا فرد اسے BB1/71 پڑھ سکتا ہے (اس بعد والے جواب کو شہادت کا حصہ تصور نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا تعلق گواہ کی مہارت سے نہیں ہے۔ اور اسے اس خاص نکتے کے بارے میں ماہر نہیں مانا جا سکتا کہ اس کی رائے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اسی بات پر فاضل وکیل کے یہ کہنے سے بھی ذرہ برابر اثر نہیں پڑے گا کہ گواہ ماہر تحریر بھی۔ ایسے ماہر کا کام دستی تحریر کی شناخت کرنا ہے اور اسے لکھنے والے فرد کی بینائی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا)"

جب سماعت کرنے والی بنچ نے یہ دیکھا کہ یہ شہادت استغاثے کے فائدے میں اور اپیل کنندہ کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے تو فیصلے کے پیراگراف ۴۲۴ میں حسب ذیل خیال ظاہر کیا۔

" اس سے موجودہ خولوں کے پیندوں کے نمبر آسانی سے نہیں

پڑھے جا سکتے اس کی تقویت استغاثے کے گواہ ۳۶ کی شہادت سے ملتی ہے اس نے کہا تھا کہ ۲۲ خولوں کے پیندوں پر لکھا ہے وہ ہے No. 661/71 لیکن اسے وہ شخص جس کی بینائی کمزور ہو اور اسے غور سے نہ دیکھے BB1/71 پڑھ سکتا ہے؟"

اس طرح جسے شہادت کے ریکارڈ کا حصہ نہ ہونا چاہیئے تھا اسے زیر غور لایا گیا۔ اور آسانی سے ریکارڈ کا حصہ بن گیا اور اپیل کنندہ کو سزا دینے کے اسباب میں سے ایک سبب بن گیا۔ اس سے مزید سماعت کرنے والی بنچ کے تعصب کی بناء پر عدلی صلاحیت کے مفلوج ہو جانے کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

۲۴۔ کہ استغاثے کی شہادتوں میں جہاں کہیں بھی خلا تھا جس کو پر کرنے میں استغاثہ ناکام رہا تھا وہاں سماعت کرنے والی بنچ کے استغاثے کو شبہے کا فائدہ دیا۔ اقبالی مجرم نے ۱۲ نومبر ۱۹۷۴ کو عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہا کہ دن کو ڈھائی بجے راولپنڈی پہنچنے پر اس نے میاں محمد عباس سے رابطہ قائم کیا۔ مگر ریکارڈ پر موجود شہادت نشاندہی کرتی ہے کہ اس دن ڈھائی بجے میاں محمد عباس پشاور میں تھے۔ اور اس شام بعد میں اسلام آباد پہنچے اور اپنے گھر شام تقریباً ۷ بجے پہنچے۔ سماعت کرنے والی بنچ نے اقبالی مجرم غلام حسین کے حلفیہ بیان کو ناقابل اعتبار قرار دینے کے بجائے اسے شبہے کا فائدہ دیتے ہوئے فیصلے کے پیراگراف ۵،۸ میں کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس نے ان سے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد چار پانچ گھنٹے بعد رابطہ قائم کیا ہو"

کیا گواہ نے کہا تھا کہ اس نے میاں عباس سے چار پانچ گھنٹے بعد ملاقات کی تھی۔؟ کیا گواہ نے کہا تھا کہ اس نے تھوڑی دیر آرام کیا تھا۔؟

گواہ نے صاف صاف کہا کہ راولپنڈی پہنچنے پر اس نے میاں عباس سے رابطہ قائم کیا۔ سماعت کرنے والی بنچ چار پانچ گھنٹے آرام کرنے والی بات کیوں لائی تاکہ اس گواہ کے حلفیہ بیان مشکوک نہ ہوں۔ یا اس اہم نکتہ پر شک نہ ہو۔

۲۵۔ اسی طرح جب استغاثے کی شہادت میں انتہائی نمایاں تضاد تھا جس سے اس مقدمہ کو نقصان پہنچتا تو سماعت کرنے والی بنچ نے شہادت کو توڑ مروڑ کر بچاؤ کی کارروائی انجام دی مثال کے طور پر استغاثے کے گواہ ۳۱۔ اقبالی مجرم غلام حسین نے سماعت کرنے والی بنچ کے سامنے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا کہ وقوعہ کے وقت اس نے پستول سے گولی چلائی اس کی گواہی یہ تھی کہ ارشد اقبال نے ہوا میں گولی چلائی اور رانا افتخار نے کار پر گولی چلائی جب کہ وہ اس وقت گلی میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا

"اس موقعہ پر اپنا پستول استعمال کرنے یا اس سے گولی چلانے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ رانا افتخار اور ارشد اقبال نے اپنے اقبالی بیانات میں کہا تھا کہ یہ اقبالی مجرم غلام حسین تھا جس نے احمد رضا قصوری کی کار پر اپنے پستول سے گولی چلائی تھی جب جرح کے دوران اقبالی مجرم سے سوال کیا گیا کہ آیا اس نے اپنے پستول سے کار پر گولی چلائی تھی تو اس نے حتمی کہا کہ اسے یاد نہیں ہے اچھی طرح یاد تھا کہ ارشد اقبال اور رانا افتخار نے گولی چلائی۔ لیکن خود اپنے گولی چلانے کے بارے میں یہ معاملہ چھوٹی سی تفصیل بن گیا۔ اس لیئے وہ یاد نہ رکھ سکا۔ بہرحال معاملہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا اس پر جرح کے دوران اس نے کہا کہ اسے یاد نہیں لیکن اس سے جب مزید سوال کیا گیا تو اس نے زور دیکر کہا کہ اس نے اپنے پستول سے بالکل گولی نہیں چلائی۔ صفحہ ۳۱۱ پر اس پر جرح کے دوران اس نے جو کہا وہ یہ ہے۔

سوال۔ کیا تم نے ۱۰ اور ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ کی رات ایک بجے اپنے پستول سے گولی چلائی اور اس کے بعد احمد رضا قصوری کی کار پر اسٹین گن سے گولیاں چلائی گئیں؟

جواب:۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے پستول سے گولی چلائی تھی کہ میں اس چوراہے سے جہاں سے فائرنگ ہوئی۔ ۳۰ گز کے فاصلے پر سڑک کی ایک شاخ دائیں طرف ہے اور میں اس سڑک پر ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا میں اس مقام سے جہاں یہ دو سڑکیں ملتی ہیں۔ ۲۰ گز کے فاصلے پر تھا اس عرصے میں میں نے کارروائی کے منصوبے پر لیاقت اور رانا افتخار سے بحث جاری رکھی۔ اور لیفٹیننٹ غلام مرتضیٰ سے بھی میں سمجھتا ہوں کہ وقوعے کے وقت میرے پاس کوئی دستی بم نہیں تھا جب سڑک پر میرے سامنے سے کار گذری تو میں نے اس پر فائرنگ نہیں کی جب میں گلی میں ٹہل رہا تھا میں نے اپنے پستول سے گولی نہیں چلائی۔

سوال:۔ کیا تم نے اسٹین گن سے گولیاں چلانے کی آواز سننے سے پہلے اور جب تم گلی میں ٹہل رہے تھے اپنے پستول سے گولی چلائی؟

جواب۔ نہیں"

گواہ کے اس پر زور انکار کے باوجود کہ اس نے اپنے پستول سے گولی نہیں چلائی سماعت کرنے والی بنچ نے اسے استغاثے کے لیئے مفید سمجھا۔ اقبالی مجرم اور دوسرے شریک کار جرم کے حلفیہ بیان اور اقبالی بیانات کے تضاد کو پیراگراف ۲،۵ میں یہ کہہ کر حل کیا کہ

۶۶۔ دلیل میں اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ غلام حسین نے جرح کے دوران بیان کیا کہ اسے یاد نہیں کہ اس نے گولی چلائی۔ یہ بیان اس امکان کو خارج نہیں کرتا کہ اس نے گولی چلائی۔"

یہ شہادت، کو استغاثے کے حق میں اور اپیل کنندہ کے سخت خلاف نے کی بے راہ روی کی مثالوں میں سے صرف ایک مثال ہے۔ وقوعہ کے متعلق استغاثے کے مقدمے میں ایک دوسرے کو تباہ کرنے والے بیانات میں مطابقت پیدا کرنا غالباً ممکن نہیں تھا لیکن سماعت کرنے والی بنچ نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ اوپر بیان کردہ باتوں سے ظاہر ہے

۲۶ نیز سماعت کرنے والی بنچ نے استغاثے کے گواہوں کی ایسی شہادت کو نظر انداز کیا ہے جو ٹھوس تفصیلات کے اعتبار سے چند دوسرے گواہان استغاثہ کے بیانات کی تردید کرتی تھی۔ مثال کے طور پر استغاثے کے گواہ ۲ مسعود محمود کے ڈرائیور استغاثے کے گواہ ۲۱ نے مسعود محمود کے اس اضافہ شدہ بیان کی تردید کی کہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ کی صبح وزیراعظم نے انہیں طلب کیا تھا اور وہ ان سے ملنے کے لیئے صادق حسین قریشی کی قیامگاہ پر گئے تھے سماعت کرنے والی بنچ نے اس گواہ کی ایک ٹھوس تفصیل کے بارے میں شہادت کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا۔ جس سے استغاثے کے بنیادی گواہ اقبالی مجرم کی گواہی کی نفی ہو جاتی ہے

(باقی آئندہ)

تحریکِ آزادی کے عظیم قائد

شیخ عبدالمجید سندھی

اُن کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکی

ہسپتال کی انتظامیہ نے

لاش لیجانے کے لئے

ایمبولینس دینے سے انکار کردیا

احسان عظیم

برِّصغیر پاک و ہند جتنا بھی ناز کرے کم ہے کہ اس نے ہر دور میں ایک دیدہ ور پیدا کیا ہے۔ اگر ماضی میں یہ دیدہ ور گوتم بدھ کی شکل میں پیدا ہوتے تو تاریخ کے جدید دور میں شیخ عبدالمجید سندھی کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ خبر درست ہے کہ شیخ عبدالمجید سندھی نوّے سال کی طویل عمر گزار کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن ان کی خدمات تاریخ کے صفحات سے کبھی بھی جدا نہیں کی جا سکیں گی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم بنیادی طور پر مردہ پرست ہیں زندگی میں اپنے مشاہیر اپنے قومی ہیروں اور اپنے دیدہ وروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ ہر ممکن طریقہ پر ان کی کردارکشی اور رتبہ گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں مشاہیر کے مرتے ہی ہم اپنے قومی عجائب گھر میں اُن کا بت سجا دیتے ہیں۔

یہی کچھ ہم نے برّصغیر کے بطلِ جلیل اور پروانہ حریت شیخ عبدالمجید سندھی کے ساتھ بھی روا رکھا ہے۔ شیخ صاحب کی رحلت کی خبر سنتے ہی ان کی قومی و ملّی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ لیکن یہ کیسا مذاق ہے کہ اسی شیخ عبدالمجید سندھی کو جسے آج تحریکِ آزادی کا ممتاز رہنما، مسلمانوں کا مخلص، بے لوث اور ہر آلائش سے پاک سرمایۂ افتخار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسپتال سے اس کی لاش لے جانے کے لئے ایل ایم سی اسپتال کے سی ایم او ڈاکٹر محمد علی میمن صاحب نے ایمبولینس تک فراہم کرنا گوارہ نہ کیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ شیخ صاحب کے صاحبزادے میجر خالد سندھی حیدرآباد کے ایڈیشنل ایس پی تھے۔ چنانچہ پولیس ایمبولینس حاصل کر پاتے ورنہ اس بطلِ جلیل اور پروانہ حریت کی لاش اٹھانے کے لئے نہ معلوم کیا پاپڑ بیلنا پڑتا۔ ستم ظریفی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ایک دکھ کی بات یہ بھی ہے کہ شیخ صاحب کی ٹھٹھہ میں دفن کئے جانے کی خواہش صرف اسی لئے نہیں تھی کہ انہوں نے ٹھٹھہ میں جنم لیا تھا۔ شیخ صاحب جد و جہد آزادی کے مجاہد تھے اپنی پوری زندگی آزادی کے حصول کے لئے لڑتے گذاری تھی۔ زندگی تو آزادی کے متوالوں کے درمیان گذاری ہی تھی، خواہش یہ تھی کہ مرنے کے بعد بھی حریت پسندوں کے قریب جگہ پائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف آزادی کی جنگ کے ایک سپوت مرزا عیسیٰ خاں ترخان کے پہلو میں دفن ہونے کی خواہش کی۔ لیکن ان ناخداؤں کو کیا کہا جائے سو وہ زندگی میں تو سندھی کو پامال کرتے ہی رہے۔ مرنے کے بعد بھی اس معمولی اور بے ضرر خواہش کی تکمیل مناسب نہ سمجھی ڈائریکٹر آرکیالوجی نے مرزا عیسیٰ خاں کے پہلو میں قبر بنانے کی اجازت نہیں دی۔ مجبوراً انہیں مخدوم محمد ہاشم کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ان حاکموں کے مزاج شاہانہ کا کیا تذکرہ کیجئے ابھی کل کی بات ہے کہ مشن روڈ پر واقع قدیم رہائشی پلاٹ نمبر ۲۱/۰۵ جو ایوکیو ٹرسٹ کی ملکیت تھی اور جسے حکومت سندھ کے فیصلے کے مطابق ننانوے سالہ لیز پر شیخ صاحب کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ فروخت کی دستاویز کی رجسٹری بھی ہوئی۔ کے ڈی اے نے نقشہ بھی منظور کر دیا۔ محکمہ لوکل باڈیز نے نو آبجکشن سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی ہدایت بھی کی لیکن کراچی میونسپل کارپوریشن کے حکام نے پلاٹ کی منتقلی میں رکاوٹ کھڑی کر دی۔ شیخ عبدالمجید سندھی کا ہندو گھرانہ صاحب حیثیت گھرانہ تھا، شیخ صاحب کو اگر مال و دولت سے پیار ہوتا تو عقیدہ تبدیل کر کے اپنے خونی رشتے نہ چھوڑتے۔ خاندانی ورثہ تو پرانی بات ٹھہری۔ شیخ صاحب نے سیاست میں اسی وقت حصہ لیا جب ان کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ سیاسی زندگی کی ابتدا سے ہی انہیں اس دور کے نامور شخصیتوں سے تعلق رہا۔ چاہتے تو سیاست کے نام پر روٹی پانی کا دھندا شروع کرتے، سرکار سے تعلق پیدا کرتے، خان بہادر اور سر بنتے، موقع بھی تھا۔ آخر سر عبداللہ ہارون بھی تو تھے کہ محنت مزدوری کرتے۔ لاکھوں کی آسامی بنے، سرکار میں بھی ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ سر کا خطاب پایا۔ مال و دولت اور سرکاری رتبے کے ساتھ قومی رہنما بھی رہے۔ لیکن فقر منش شیخ عبدالمجید سندھی کا یہ عالم کہ بمبئی پریسیڈنسی میں سندھ کے نمائندے رئیس غلام محمد بھرگڑی کے پرائیویٹ سکریٹری اور مشیر ہونے کے باوجود کرائے کے مکان میں رہائش، پیدل سفر اور سادہ زندگی اپنائی اور زندگی کی آخری سانس تک اپنی نفس کشی کو برقرار رکھا۔

حُبّ الوطنی، قوم پرستی اور عوام دوستی کا معیار دیکھنا ہو تو سندھی کی زندگی سے دیکھیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی آپا زہرہ کی روایت کے مطابق کراچی میں زبردست بارش کے نتیجہ میں شہر میں کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ سر عبداللہ ہارون کے غلّے کے گودام بھی بارش کے پانی میں ڈوب گئے۔ لاکھوں کا گیہوں ضائع کیسے کرتے۔ تاجر خواہ قومی رہنما ہو۔ اوّل اور آخر تاجر ہوتا ہے نقصان کا سودا کس طرح کرتا۔ بارش کے پانی سے سڑی ہوئی گندم فروخت کے لئے بازار میں لائے۔ شیخ صاحب کو معلوم ہوا کہ گندم مضرِ صحت ہے۔ عوام کی صحت اور زندگی کے تحفظ کے لئے۔ ناکارہ گندم کا استعمال نقصان دہ پایا۔ سر عبداللہ ہارون سیاست میں ساتھی بھی تھے اور دوست بھی۔ ہندو سے مسلمان ہونے کے موقع پر ہندوؤں کے انتقام سے بچانے والے محسن بھی تھے۔ عام حالات میں خاموش تماشائی ہوتے لیکن اصول پسندی انہیں حق

کے راستہ پر لے آئی۔ ناقص گندم کے فروخت کے خلاف دروازے دروازے پھر کر مہم شروع کی۔ صاحب حیثیت لوگوں نے تو ناقص گندم خریدنا بند کر دیا لیکن غریب عوام کیا کرتے۔ شیخ صاحب جہاں دردمند دل رکھتے تھے وہیں جرات و حوصلے میں بھی کم نہ تھے۔ انہوں نے عوام کو جمع کیا اور سر عبداللہ ہارون کے گندم کے ذخیرے کو آگ لگا دی۔ سر صاحب سخت ناراض ہوئے۔ شکایت کی کہ میں نے ہندوؤں کے ظلم سے تمہیں بچانے کے لئے بہت کچھ کیا تھا کیا میرے سلوک کا یہی صلہ ہے۔ شیخ صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ میری زندگی عوام کے لئے ہے میں ان کے مفاد سے غداری نہیں کر سکتا۔ ذاتی سلوک کا بدلہ قومی غداری اور عوام دشمنی نہیں ہو سکتا۔ آج انسانی سماج ترقی کی اس منزل پہ پہنچ چکا ہے جہاں یکے بعد دیگرے قومیں سامراج کی غلامی کی زنجیریں توڑ رہی ہیں سامراج اپنی تباہی اور بربادی کے آخری کنارے پر کھڑا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ لیکن پہلی عالمی جنگ سے پیشتر سامراج اپنی پوری توانائی کے ساتھ ظلم و استحصال اور بربریت میں مشغول تھا۔ قومی آزادی کا تصوّر دیوانے کی بڑ تھی۔ آج کے بڑے بڑے نام انگریزی استعمار سے چند معمولی مراعات کا حصول اپنا مقدر قرار دیتے تھے۔ لیکن اس دور میں آزادی پسند سرگرم عمل تھے۔ ان میں ایک شیخ عبدالمجید سندھی بھی تھے۔ شیخ صاحب نے عوام کو بیدار کرنے کے لئے ایک طرف اخبار ''الامین'' کے ذریعہ قلمی جہاد شروع کیا۔ تو دوسری طرف مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریک میں عملی شرکت کی۔ جیل گئے۔ اور جب انگریزوں کے خلاف خلافت تحریک شروع ہوئی تو شیخ صاحب پہلی صف میں کھڑے تھے۔ شیخ صاحب کا نام سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک میں بھی بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے بعد شیخ صاحب انتخاب میں سر شاہنواز بھٹو کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔

شیخ صاحب سندھ میں مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ قرارداد پاکستان کی ترتیب بھی ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ سندھ اسمبلی میں جب مسلم لیگ کی پہلی وزارت تشکیل پائی تو شیخ صاحب وزیر مال مقرر ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور آزاد پاکستان پارٹی کے کنوینر سندھ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان کا سیاسی سفر انہیں نیشنل عوامی پارٹی کی صفوں میں لے آیا اور وہ سندھ کے صدر منتخب ہوئے۔ ایوبی مارشل لا کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے بی ڈی نظام کے خلاف وہ محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں سرگرم عمل ہوئے۔ اور پھر ۱۹۷۰ء میں حیدرآباد میں منعقد ہونے والے متحدہ محاذ کا قومی کنونشن آخری کنونشن تھا جس میں اس بطل جلیل نے شرکت کی اور اس کے بعد وہ سیاسی افق سے وجودی طور پہ معدوم ہو گئے لیکن ان کے خیالات و جدوجہد کی بازگشت رہتی دنیا تک سُنی جائے گی۔

حکومت بجٹ بناتے وقت غریب آدمی کے مفاد کو پیش نظر رکھے، موجی

پیپلز مسلم لیگ کے چیئرمین مسٹر حیدر علی موجی نے ایک بیان میں فوجی حکومت کو آئندہ بجٹ تیار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینے اور نوکر شاہی کی سازشوں سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا ہے اور سرمایہ کاری کی فضا کو بہتر بنانے اور غریب آدمی کے مفاد کو سامنے رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ برطانیہ اور سویڈن کے بجٹ سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے انہوں نے کہا کہ آئندہ تین ماہ میں قوم کا مزاج کیا بنتا ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ افراطِ زر کے لگائے ہوئے زخموں پر کس حد تک نمک پاشی ہوتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ چونکہ پارلیمنٹ موجود نہیں ہے اس لئے وہ مشیر جو احتساب کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں وہ ٹیلی ویژن پر آئیں اور قرآن پر حلف لے کر قوم کو بتائیں کہ وہ ملک سے باہر غیر ملکی زرِ مبادلہ کی تجارت نہیں کر رہے ہیں اور ٹیکس کے حکام اور اسٹیٹ بنک کی اجازت اور علم کے بغیر بیرونِ ملک کوئی کاروبار نہیں کر رہے ہیں نہ ہی کوئی جائیداد ان کی ملکیت میں ہے انہوں نے کہا کہ جو پاکستانی ملک کے باہر کام کر رہے ہیں وہ اپنی ۹۰ فیصد آمدنی با اثر لوگوں کے ذریعے اسٹیٹ بنک کو بتائے بغیر ملک بھیج رہے ہیں جس سے دوکانیں اور مکانات وغیرہ خریدے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں بتایا جائے کہ آئندہ انہیں یہ حساب دینا ہوگا کہ یہ ملکیت انہوں نے کس ذریعے سے خریدی۔ اس طرح زرِ مبادلہ کے غیر قانونی لین دین پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض پاکستانی افراد تبلیغ کے بہانے افریقہ کا دورہ کرتے ہیں جب کہ ان کا اصل کاروبار ہیرے کی اسمگلنگ ہے۔ افریقہ سے ہجرت کرنے والے بعض لوگ تنزانیہ کا دوسرا پاسپورٹ بھی رکھتے ہیں اور اس کے سہارے ہندوستان جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان اور تنزانیہ دونوں دولت مشترکہ کے رکن ہیں۔ یہ

رضائیوں میں چھپا کر ہیرے لے جاتے ہیں اور یہ بات کسٹم کے حکام کے علم میں ہے۔

مسٹر موجی نے بنک کی شرح سود ۱۴ فیصد مقرر کرنے کو نوکر شاہی کی سازش قرار دیا۔ ایک قرض لینے والا قرض کی رقم اپنے اور سرمائے سے سالانہ ۲۰ سے ۲۵ فیصد منافع حاصل کرتا ہے جس میں سے وہ بنک کو ۱۴ فیصد ادائیگی کرتا ہے۔ اس طرح قرض لینے والا کم حصّہ پاتا ہے اور بنک بغیر نقصان میں شرکت کے منافع میں بڑا حصّہ دار بن جاتا ہے۔ جو ارتکاز سرمایہ اور صنعتی ترقی کے لئے کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں۔ آئندہ بجٹ میں اس خامی کو دور کر دینا چاہیئے۔

انتظامیہ نے ٹریبونل کی رپورٹ شائع کرنے سے انکار کر دیا

حالیہ انتخابات کے دوران جامعہ کی انتظامیہ نے جمعیت کی جس طرح حمایت و طرفداری کی اس سے ان کی جانب داری اور میجر آفتاب حسن کی جانب داری میں بہت معمولی فرق رہ گیا ہے پہلے میجر آفتاب ترقی پسندوں کے خلاف کارروائیوں کی براہ راست خود نگرانی کرتے تھے اور اب موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید نے یہ ذمہ داری جمعیت کے طلباء اور دوسرے اداروں کے سپرد کر دی ہے۔

حالیہ انتخابات کے نتائج سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جامعہ کراچی میں جمعیت کی بنیادیں ہل رہی ہیں انتخابی نتائج کی رو سے صدر کے لیے مصطفین کاظمی جنرل سیکرٹری کے لیے مظفر معراج اور جوائنٹ سیکرٹری کے لیے طیب خان کامیاب ہو رہے تھے کہ یکدم آخری منٹ میں مظفر معراج کو آٹھ ووٹوں سے ہرا دیا گیا ان نتائج کو مظفر معراج نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مظفر معراج نے الیکشن کمشنر ڈاکٹر رفیق سے اسی وقت تحریری طور پر مطالبہ کیا کہ ووٹوں کی گنتی دوبارہ کروائی جائے ڈاکٹر رفیق نے جو ووٹوں کی گنتی کے دوران جمعیت کی حمایت کرتے رہے تھے کہا کہ تھک گئے ہیں۔ اس لیے وہ ہفتے کے روز ووٹوں کی گنتی دوبارہ کریں گے۔ ہفتے کے دن جب مظفر معراج اپنے کاؤنٹنگ ایجنٹوں کے ساتھ ڈاکٹر رفیق کے پاس پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ انتخابی عذرداری کے لیے شیخ الجامعہ نے ایک ٹریبونل قائم کر دیا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر ترمذی ڈین فیکلٹی آ[illegible]رٹس ڈاکٹر [illegible] حسین اور ڈین فیکلٹی آف فارمیسی ڈاکٹر صابر اس کے ممبر ہیں آپ ان کے سامنے اپنی عذرداری پیش کریں مظفر معراج نے ایک تحریری عذرداری داخل کی جس میں کہا گیا تھا کہ ایک طالب علم خواجہ تنویر احمد کا نام بیلٹ پیپر پر شائع کیا گیا جبکہ اس طالب علم نے جنرل سیکرٹری کی سیٹ سے باقاعدہ دست برداری کا اعلان کر دیا گیا تھا اور اس کی تحریری اطلاع الیکشن کمشنر کو دے دی گئی تھی۔ مگر صرف ووٹرز کو الجھن میں ڈالنے کے لیے خواجہ تنویر کا نام بیلٹ پیپر پر شائع کیا گیا کیونکہ مظفر معراج کا پورا نام خواجہ مظفر معراج ہے اس لیے بہت سے طالب علموں نے غلطی سے پہلے خواجہ تنویر کے نام کے آگے نشان لگایا پھر خواجہ مظفر معراج کے نام کے آگے لگایا۔ اس طرح دانستہ طور پر مظفر معراج کے خلاف سازش کی گئی۔ مظفر معراج نے اپنی عذرداری میں کہا کہ کئی ڈیپارٹمنٹ میں پولنگ جہاں پر جمعیت کے ووٹروں کی اکثریت تھی وقت گزرنے کے بعد بھی جاری رہی جب مظفر معراج کے پولنگ ایجنٹوں نے اس پر احتجاج کیا تو بھی پولنگ بند نہیں کی گئی عذرداری میں کہا گیا کہ ووٹوں کی گنتی کے وقت الیکشن کمشنر نے جانبداری کا مظاہرہ کیا اور مظفر کے بہت سے ووٹوں کو بغیر کسی جواز کے مسترد کر دیا گیا جب مظفر کے ایجنٹوں نے اعتراض کیا تو کہا گیا کہ الیکشن کمشنر کا فیصلہ حتمی اور آخری ہے عذرداری میں کہا گیا کہ مسترد شدہ ووٹوں کی صحیح تعداد کا اعلان آخری وقت تک نہیں کیا گیا جبکہ اس کے لیے بارہا تحریری اور زبانی طور پر مطالبہ کیا گیا۔ کہ کچھ ڈیپارٹمنٹ میں ایسے لوگوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی جن کی شکلیں آج تک جامعہ میں نہیں دیکھی گئی تھیں یہ لوگ جامعہ کے باقاعدہ طالب علم نہیں تھے اس لیے انہیں ووٹ ڈالنے کا حق نہیں تھا عذرداری میں کہا گیا کہ خواجہ تنویر نے بیک وقت الیف آر اور جنرل سیکرٹری کا فارم بھرا تھا جو کہ غیر قانونی تھا اس لیے بھی اس کا نام بیلٹ پیپر پر موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔

عذرداری میں مزید کہا گیا کہ ووٹوں کی مزید گنتی دوبارہ فوراً ہونی چاہیے اب ووٹوں کی گنتی کے وقت ان اساتذہ کو جنہوں نے پہلے گنتی میں حصہ لیا تھا کو شریک نہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے جانبداری کا مظاہرہ کیا تھا ان کی جگہ غیر جانبدار اساتذہ کو مقرر کیا جائے ووٹوں کی گنتی کے وقت مظفر معراج یا ان کے نامزد کردہ کسی سابق طالب علم کو اجازت دی جائے کہ گنتی کے وقت مظفر معراج کی نمائندگی کر سکیں۔

اس عذرداری کے ساتھ خواجہ تنویر نے ایک حلف نامہ داخل کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اس نے مقررہ تاریخ پر جنرل سیکرٹری کی نشست سے دست بردار ہونے کی تحریری طور پر الیکشن کمیشن کو اطلاع دے دی تھی۔

الیکشن ٹریبونل نے دو دن تک اس عذرداری کی سماعت کی۔ مظفر معراج، خواجہ تنویر اور دوسرے ذرائع سے مختلف معلومات حاصل کیں۔ معلومات حاصل کرنے پر حقائق جمع کیے۔ معلوم ہوا ہے کہ ٹریبونل نے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ ووٹوں کی گنتی ہونی چاہیے۔ مگر آخری وقت میں وائس چانسلر نے ٹریبونل کی رپورٹ منگوائی اور قانونی اور اخلاقی طریقہ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے یکطرفہ طور پر اخبارات میں یہ اعلان کروا دیا کہ ۱۹ مئی کے نتائج درست تھے جبکہ اخلاقی اور قانونی طور پر وائس چانسلر کی ذمہ داری تھی کہ ٹریبونل کی رپورٹ کو شائع کرے اور اس کی اطلاع شکایت کنندہ کو ضرور دیتے مگر ابھی تک اس سلسلہ میں مظفر معراج کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

وائس چانسلر کے یکطرفہ اعلان کے بعد جامعہ کراچی کے طلباء و طالبات میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی انجمن طلباء کے نو منتخب صدر مصطفین کاظمی نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ اعلیٰ حکام کے کہنے پر کیا گیا ہے ہم اب سرکاری مداخلت کو مزید برداشت نہیں کریں گے انہوں نے کہا کہ اس یکطرفہ کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ کراچی کے طلباء و طالبات کو اشتعال دلایا جائے اور پھر

جامعہ کراچی کو بند کر دیا جائے مگر طلبا اب ان ہتھکنڈوں کا شکار نہیں ہوں گے انہوں نے کہا کہ جامعہ کو بند کرنے کی کوشش کی گئی تو طلبا ایسا نہیں کرنے دیں گے مصطفین کاظمی نے کہا کہ ووٹوں کی دوبارہ گنتی کروانا ہر امیدوار کا جمہوری حق ہے اور انتظامیہ کو اس مطالبہ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ مظفر معراج نے طلب کے ایک احتجاجی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے الزام لگایا کہ جب ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی تو دو سرکاری افسر وائس چانسلر کے دفتر میں موجود تھے جہاں سے ایک خفیہ چٹ الیکشن کمشنر کو بھیجی گئی اور اس کے بعد نتائج میں تبدیلی کی گئی

بحیثیت اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مظفر سعید نے کہا کہ سرکاری حکام براہ راست جامعہ کے معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں ہماری عہدیداری حکام بالا کے دباؤ کی بنا پر مسترد کی گئی ہے تاکہ ہماری یونین اپنے فرائض انجام نہ دے سکے۔ مگر ہم ان سازشوں کو ناکام بنا دیں گے۔

بقیہ : سرورق

ہونے کے لیے تیار نہیں وہ مؤثر کنٹرول اور اختیارات چاہتی ہیں البتہ پیپلز پارٹی سے برطرف شدہ مولانا کوثر نیازی اپنے سواروں کے ساتھ قومی حکومت کے حق میں ہیں خفیہ ہاتھوں نے انہیں پیپلز پارٹی کا نام نہاد قائم مقام چیئرمین بھی بنا دیا ہے اور ان کے سواروں میں ملک اختر بھی ہیں وہی ملک اختر جنہوں نے ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں سب سے زیادہ دھاندلی کی۔ قومی اتحاد اور اخباری اطلاعات کے مطابق پولنگ بوتھوں پر اسٹین گن سے فائرنگ کی لیکن اب یہی ملک اختر "نیک نام اور پارسا" ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور اوپر والے بھی انہیں "پارسا" سمجھتے ہیں

الغرض جب قومی حکومت کا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا تو پاکستان کے رنگیلے جنرل یحییٰ نے گئے آئے یا آگے لائے گئے کیونکہ بعض اوقات کھوٹا سکہ بھی چل جاتا ہے لیکن یہ حکمت عملی بھی ناکام رہی۔ مقصد تو پورا نہیں ہو سکا۔ البتہ یحییٰ خان کو نظر بندی سے نجات مل گئی۔ نور جہاں اور جنرل رانی اور بیگم بوناگرد خوش ہیں کہ پیپلز پارٹی کے دور میں جو محفل طرب نہ جم سکی وہ اسلامی مارشل لا کے دور میں جمے گی۔

بقیہ : تخفیف اسلحہ

مطالبہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۶ء میں سری لنکا کے دورے میں بھی انہوں نے مسز بندرا نائیکے سے غیر جانبدار ممبر ملکوں کی کانفرنس میں جو اسی سال کولمبو میں منعقد ہوئی تھی بحر ہند کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد پیش کرنے کا اصرار کیا۔ اور جب بعد میں غیر جانبدار ملکوں کی کولمبو کانفرنس نے بھاری اکثریت سے تسلیم کر لیا۔ تیسری دنیا کے ایک رکن ملک کے سربراہ کی حیثیت سے جناب بھٹو کی نہ صرف ایک نئے بین الاقوامی نظام کے قیام کی کوششوں کو اہمیت حاصل تھی۔ بلکہ انہوں نے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو محدود کرنے کے سلسلے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ لیکن افسوس کہ اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ایک خصوصی اجلاس تخفیف اسلحہ کے بارے میں منعقد ہو رہا ہے اور جس میں تیسری دنیا کے ممالک کو اہمیت حاصل ہے، جناب بھٹو ایک سیاسی قتل کے الزام میں جیل کی تاریک کال کوٹھری میں قید ہیں۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے قبل تیسری دنیا کو جناب بھٹو نے جس قدر متحرک کر رکھا تھا۔ آج اسی قدر اس کی متحرک حرارت سرد پڑتی نظر آ رہی ہے۔ اس وقت تیسری دنیا پھر قیادت سے محروم ہے۔ ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کے لیے جو سرگرمی عالمی سطح پر پائی جاتی تھی وہ بھی اب سرد پڑ چکی ہے۔ جناب بھٹو نے تیسری دنیا کے سربراہوں کی کانفرنس اور اس کے کاز کو جہاں چھوڑا تھا وہ ابھی تک جوں کا توں وہیں موجود ہے۔ ادھر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے پاکستان کا جھکاؤ بھی تیسری دنیا سے دوبارہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کی جانب بڑھتا جا رہا ہے۔

پاکستان میں غیر منتخب حکومت اور سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے اقوام متحدہ کے تحت تخفیف اسلحہ کے اس خصوصی اجلاس میں پاکستان اپنا کردار ادا نہیں کر سکے گا جو اس نے ایک منتخب سیاسی حکومت کے دور میں بین الاقوامی امور میں ادا کیا تھا اور جس کی وجہ سے پاکستان کو عالمی برادری میں ایک خصوصی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ موجودہ حالات میں جبکہ مہلک ایٹمی ہتھیاروں کو نہ صرف عالمی سطح پر فروغ حاصل ہو رہا ہے بلکہ علاقائی سطح پر ترقی پذیر ممالک بھی اس مرض میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ اب صرف سپر پاورز بڑے صنعتی ممالک ہی بڑے بڑے جدید ہتھیار تیار نہیں کر رہے ہیں بلکہ تیسری دنیا کے بیس سے زیادہ ممالک بھی مختلف قسم کے جدید ہتھیار تیار کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور اس بات کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ تیسری دنیا کے بعض ممالک دوسرے غریب ملکوں کو ہتھیار فراہم کرنے لگیں گے۔ لہٰذا اقوام متحدہ کے تحت تخفیف اسلحہ کی یہ کانفرنس خصوصی اہمیت کی حامل ہے اس کانفرنس سے برطانیہ، کینیڈا اور ہندوستان اور یوگوسلاویہ کے وزرائے اعظم، مغربی جرمنی کے چانسلر، امریکہ کے نائب صدر اور روس کے وزیر خارجہ خطاب کریں گے۔ لیکن جنوبی ایشیا کے ملکوں میں صرف ہندوستان کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کے خطاب کرنے کا امکان ہے اور پاکستان کی جانب سے دفتر خارجہ کے سیکرٹری آغا شاہی شرکت کریں گے جنہیں عبوری حکومت میں مشیر کا رتبہ حاصل ہے

ہندوستان ایٹمی طاقت بننے کی طرف گامزن ہے

اس وقت جنوبی ایشیا میں اور خصوصاً بحر ہند کی سیاست میں اسے فوجی اور سیاسی اعتبار سے برتری حاصل ہے۔ صدر کارٹر نے حال ہی میں تارہ پور کے ایٹمی پلانٹ کے لیے یورینیم کی سپلائی کی اجازت دے دی ہے اور ہندوستان کو علاقہ کا "چودھری" بھی تسلیم کر لیا ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقوام متحدہ کی تخفیف اسلحہ کی اس خصوصی کانفرنس میں جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کے بارے میں بھی کوئی مؤثر آواز بلند ہو گی؟ اور کیا بحر ہند کو بھی مہلک ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کے بارے میں کوئی ٹھوس موقف اختیار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس بات کا دارومدار بحر ہند سے قریب تر ممالک اور خصوصاً جنوبی ایشیا کے ملکوں پر ہے کہ وہ کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔

بقیہ : جیل سے غوثی کا خط

ملتا تھا لیکن مارک ٹیلی کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ پرسوں تک ہمیں صرف "نوائے وقت" ملتا تھا۔ وہ بھی ڈاک ایڈیشن۔ جس میں دو دن پرانی خبریں ہوتی تھیں۔ یوں بھی "نوائے وقت" ہماری تحریک کے بارے میں خبریں نہیں دیتا ہے، ابھی کل سے "امروز" "آزاد" اور "پاکستان ٹائمز" ملنا شروع ہوئے تو پتہ چلا کہ چھاپڑا کو بھی سزا ہو گئی ہے اور وہ ساہیوال جیل میں ہے۔ آج کے اخبار میں ظفر قریشی کی گرفتاری کی خبر بھی پڑھی۔

میرے ساتھ پاکستان ٹائمز اسلام آباد بیورو کے اسلم شیخ امروز ملتان کے حشمت وفا، اے پی پی ملتان کے محمد افضل پاکستان ٹائمز پنڈی کے نسیم الزماں، مساوات لاہور کے شیر افگن اور ملت (گجراتی) کراچی کے عبدالحفیظ ہیں۔ جیل میں ہمیں اپنی بے چارگی کا بہت احساس ہے کہ ہم اپنی تحریک کے لیے اب کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن کیا کریں مجبور ہیں۔

تمہارا دوست

صبیح الدین غوثی

پاکستانی حکومت کے اقدامات غیر انسانی اور غیر مہذب ہیں

سیاسی افراد کو اظہار رائے اور سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں کوڑے لگائے گئے

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ

پاکستان کے بارے میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی جزوی رپورٹ ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء کو لندن میں شائع کر دی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں سیاسی قیدیوں کو اظہار خیال کے الزام میں کوڑوں کی سزا اسنائی جا رہی ہے۔ انہیں کوڑے لگائے جا رہے ہیں سینکڑوں سیاسی کارکنوں کو قید سخت کی سزائیں دی جا چکی ہیں اور ہزاروں پابند سلاسل ہیں۔ رپورٹ میں پاکستان کی فوجی حکومت کے ان اقدامات پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں اور خصوصی عدالتوں کو فوراً ختم کیا جائے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے نے جنوری ۱۹۷۸ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اور اس دورے کے دوران جو واقعات اور حالات ان کے علم میں آئے۔ وہ مذکورہ بالا رپورٹ میں شامل کر دیتے گئے ہیں۔ رپورٹ کے ابتدائیہ میں ہی لکھا ہے کہ رپورٹ کا مواد جنوری ۱۹۷۸ء میں جمع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پاکستان کی صورتحال میں بہت بڑی اور قابل ذکر تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ خصوصاً بر سر عام پھانسی دینے کا واقعہ، ابتدائیہ میں کہا گیا ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے یہ رپورٹ شائع کرنے کا ارادہ دو مرتبہ ملتوی کیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شاید پاکستان کی فوجی حکومت غیر انسانی اور غیر مہذب اقدامات میں اس حد تک آگے نہیں جائے گی اور قرون وسطیٰ کی سزاؤں کو ترک کر دے گی۔ لیکن جب مارچ کے پہلے ہفتے میں فوجی عدالت کے حکم پر تین افراد جن پر ایک لڑکے کو اغوا اور قتل کرنے کا الزام تھا کو سر عام پھانسی دی گئی اور اس کے بعد سابق وزیراعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر چار افراد کو بھی موت کی سزا سنائی گئی۔ تب ایمنسٹی انٹرنیشنل نے رپورٹ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

رپورٹ میں مسٹر بھٹو اور دیگر چار افراد کو قتل کے الزام میں سنائی جانے والی سزائے موت کو کم کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہے، سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ اس لیے

فاروق طارق

نمائندہ خصوصی برائے یورپ

مقیم ایمسٹرڈم

...... ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مقدمے کی آخری لیکن اہم کارروائی کی سماعت بند کرے میں کی گئی۔ اور اس کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس لیے عالمی مبصروں کو اس مقدمے میں اپیل کرنے کی اجازت دی جانی چاہیئے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دورہ پاکستان کے دوران ایمنسٹی کے نمائندے کو مسٹر بھٹو سے اس جگہ ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جہاں انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اس وقت سینکڑوں سیاسی کارکنوں کو سزائیں دی جا چکی ہیں اور ہزاروں پابند سلاسل ہیں۔ ماہ مئی کے اوائل میں متعدد اخبار نویسوں کو اس وقت گرفتار کیا گیا اور سزائیں سنائی گئیں۔ جب وہ مسٹر بھٹو کے حامی ایک اخبار کی اشاعت پر پابندی کے خلاف بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ اخبار کے مدیر اور مدیر معاون کو پہلے ہی قابل اعتراض مواد شائع کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اور سزا دی جا چکی ہے۔ مسٹر تھامس ہمبرگ نے کہا کہ حال ہی میں پاکستان سے رپورٹ آئی ہے کہ چار صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ میں پاکستان کی فوجی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ شہری افراد کو فوجی عدالتوں سے سزائیں دینا بند کرے۔ سیاسی کارکنوں اور صحافیوں کو کوڑے لگانے بند کر دے۔ مسٹر بھٹو کی پارٹی کے افراد اور سیاسی کارکنوں کو رہا کرے اور نظر بندی کے احکامات واپس لے۔ رپورٹ میں سب سے زیادہ تنقید کوڑوں کی سزا پر کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ "عالمی قانون کے تحت کوڑے کی سزا غیر انسانی سزا ہے ہمیں یہ دیکھ کر صدمہ ہوا ہے کہ سیاسی افراد کو اظہار رائے اور سیاسی سرگرمیوں کے "جرم" میں کوڑے لگائے گئے۔ اور ہماری اطلاع کے مطابق پاکستان میں اب تک کم از کم سولہ افراد کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے الزام میں کوڑے لگائے جا چکے ہیں"۔

تحریک آزادی کے عظیم قائد شیخ عبدالمجید سندھی